www.mohaddis.com

331

مدیر اعلیٰ
حافظ عبدالرحمن مدنی

ملتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

محدث

اگست ۲۰۰۹ء

۲ دینی تعلیم اور معاشرے کی اسلامی تشکیل
۱۷ رمضان المبارک کے فضائل واحکام
۶۱ پرویز کے ایمان بالقرآن کی حقیقت

مجلس التحقیق الاسلامی
ISLAMIC RESEARCH COUNCIL

ماہنامہ محدث لاہور

ماہنامہ 'محدث' لاہور کا اجمالی تعارُف

مُدیرِ اعلیٰ: حافظ عبدالرحمٰن مدنی **مُدیر:** ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

ماہنامہ 'محدث' لاہور، ہندوستان سے نکلنے والے ایک رسالے کی ہی ارتقائی شکل ہے۔ جامعہ رحمانیہ دہلی سے نکلنے والے رسالے - جس کا نام محدث تھا- کو پروان چڑھاتے ہوئے تقسیمِ ہند کے بعد دوبارہ ماہنامہ 'محدث' لاہور کے نام سے پاکستان میں معروف عالم دین ودانشور حافظ عبدالرحمٰن مدنی حفظہ اللہ نے اس کا اِجراء کیا۔ یہ تحقیقی رسالہ ۱۹۷۰ء سے اب تک کامیابی وکامرانی سے شائع ہورہا ہے، وللہ الحمد!

محدث کی علمی پہچان کے حوالے سے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ ہر صاحبِ علم وفضل کی ضرورت بن چکا ہے کیونکہ اس کے مضامین جدید فکر کے حامل اور ملحدانہ افکار کیلئے شمشیر بے نیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گھر بیٹھے 'محدث' وصول کیجئے!

قارئین کرام! گھر بیٹھے محدث حاصل کرنے کیلئے درج ذیل طریقہ کار اختیار کریں!

فی شمارہ: ۲۰روپے **زرِ سالانہ:** ۲۰۰روپے **بیرون ملک:** ۲۰ڈالر

بذریعہ منی آرڈر/بینک ڈرافٹ ۲۰۰روپے بھیج کر سال بھر گھر بیٹھے محدث وصول کریں اور علمی وتحقیقی مضامین سے استفادہ کریں۔ **ایڈریس:** ماہنامہ محدث، ۹۹جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۵۴۷۰۰

فون نمبر: 35866476 / 042 - 3586639 **موبائل:** 0305 - 4600861

انٹرنیٹ پر محدث پڑھنے اور ڈاؤن لوڈ کرنے کیلئے درج ذیل ویب سائٹ دیکھئے!

www.kitabosunnat.com __ www.mohaddis.com

مزید تفصیلات کیلئے: webmaster@kitabosunnat.com

اجرائے مُحدث کے مقاصد

- عناد اور تعصّب قوم کیلئے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں!
لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کیلئے رحمت کا باعث ہے۔

- علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں!
لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

- غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے!
لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سر انجام نہ دینا حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

- تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالح دینیہ کے خلاف ہے!
لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین و مسائل اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

- آئین و سیاست سے بیگانہ ہر کر عبادت کیلئے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے!
لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

- جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے!
لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ محدث لاہور

کا مطالعہ فرمائیے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ!
کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

ملّتِ اسلامیہ کا علمی و اصلاحی مجلّہ

ماہنامہ محدّث لاہور پاکستان

مُدیرِ اعلیٰ
حافظ عبد الرحمن مدنی

مُدیر
حافظ حسن مدنی
Only For SMS
0333-4213525

جلد ۴۱ ، شمارہ ۸ ـــ شعبان المعظم ۱۴۳۰ھ ـــ اگست ۲۰۰۹ء

فہرست مضامین

فکر و نظر
دینی تعلیم اور معاشرے کی اسلامی تشکیل — ڈاکٹر حافظ حسن مدنی — ۲

اَحکام و شرائع
رمضان المبارک کے اَحکام ومسائل — محمد اَرشد کمال — ۱۷

تعلیم و تعلّم
اسلام کا تصورِ تعلیم — ڈاکٹر محمود احمد غازی — ۴۲
اسلامی مدارس اور تعلیم کی خشتِ اوّل — مولانا محمد بشیر — ۵۱

تحقیق و تنقید
پرویز کے ایمان بالقرآن کی حقیقت — ڈاکٹر محمد دین قاسمی — ۶۱

زهد و احسان
عبادات میں احسان واخلاص — مولانا عمر فاروق سعیدی — ۸۱

اسلام اور مغرب
جدید اعتزال کے فکری ابہامات کا جائزہ ② — زاہد صدیق مغل — ۹۹
صدرِ امریکہ بارک حسین اوباما ہی کیوں؟ — طارق عادل خاں — ۱۱۸

زرِ سالانہ
۲۰۰/= روپے
فی شمارہ ۲۰/= روپے

بیرونِ ملک
زرِ سالانہ
۲۰/= ڈالر
فی شمارہ ۲/= ڈالر

Monthly MUHADDIS A/c No: 984
UBL - Model Town Crossing, Lahore

دفتر کا پتہ
۹۹ جے، ماڈل ٹاؤن
لاہور 54700

☎ : 5866476
5866396
5839404
Email:
hhasan@wol.net.pk

Publisher:
Hafiz Abdul Rahman Madani
Printer:
Shirkat Printing Press, Lahore

Islamic Research Council

محدّث کتاب وسنّت کی روشنی میں آزادانہ بحث وتحقیق کا حامی ہے ادارہ کا مضمون نگار حضرات سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکر و نظر

دینی تعلیم اور معاشرے کی اسلامی تشکیل

مدارسِ دینیہ کے تناظر میں

رمضان المبارک سے قبل دینی مدارس کا تعلیمی سال مکمل ہوجاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہر سال دینی مدارس سے سینکڑوں فضلا فارغ التحصیل ہوتے ہیں، لیکن آگے معاشرے میں مدارس کے ان فضلا کے لئے مناسب گنجائش موجود نہیں ہوتی، اس لئے مدارس کو اپنی تعلیم کی نوعیت میں تبدیلی کرکے اپنے نصاب کو دین و دنیا کا اس طرح جامع بنانا چاہئے کہ اس کے فضلا تحصیل علم کے بعد محض مسندِ علم وارشاد سنبھالنے کی بجائے دیگر شعبہ ہائے زندگی میں بھی کھپ سکیں۔ بعض لوگ آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ مدارس کے یہ ضرورت سے زائد فضلا اپنے اپنے حلقے میں تعصّبات کے پھیلاؤ اور ان کی بنا پر غیر ضروری مراکز و مساجد کے قیام کا سبب بنتے ہیں اور فرقہ وارانہ سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ بسا اوقات تشدد پسندی میں بھی ملوث ہوجاتے ہیں۔

ایک طرف اس طرح کے خیالات رکھنے والے لوگ ہیں تو دوسری طرف یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مدارس کے فضلا کی مزعومہ کثرت اپنی جگہ لیکن معاشرے میں مطلوبہ دینی رہنمائی کے لئے خلا بھی روز بروز بڑھتا جارہا ہے اور مختلف دینی مناصب پر کام کرنے کے لئے موزوں اَفراد کے حصول میں بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات وہ سرے سے دستیاب ہی نہیں ہوپاتے۔ ایسے لوگ جو مدارسِ دینیہ کے تعلیم یافتہ ہیں، ان کی تعداد تو کافی ہے لیکن ان میں موزوں طور پر دینی خدمات انجام دینے والے اور معاشرے کے دینی تقاضے پورے کرنے والے لوگ خال خال دکھائی دیتے ہیں، البتہ اس قلت کا احساس وہی لوگ کرسکتے ہیں جنہیں اللہ نے فکر و بصیرت اور اسلام سے گہری وابستگی کی نعمت سے بہرہ مند کیا ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ مدارس میں مطلوبہ تربیت نہیں ہوپاتی یا مدارس کے ذہین طلبہ دینی رہنمائی کے بجائے دیگر شعبوں کا رخ کرلیتے ہیں اور اس نظام میں بچے کھچے طلبہ رہ جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مدارس کے فضلا کے کردار کو توسیع دیئے بغیر بھی معاشرے کے

جملہ دینی تقاضے پورے نہیں کئے جاسکتے۔ تفصیل اس اِجمال کی حسب ذیل ہے:

تعلیم اور معاشرہ کا باہمی تعلق

واضح رہنا چاہئے کہ کسی بھی تعلیمی ادارے یا نظامِ تعلیم کے لئے محض ایک مثالی نظامِ تعلیم و تربیت دے دینا ہی کافی نہیں اور کسی ادارے میں تعلیم و تربیت کے مثالی ہوجانے کا بھی یہ مطلب نہیں کہ ایسے لوگ مستقبل میں اپنے تحصیل علم کے اہداف و مقاصد پورے کرپائیں گے بلکہ فی زمانہ بعد از فراغت، معاشرے میں ان کے لئے مجوزہ کردار غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوچکا ہے۔ بہت سے تعلیمی ادارے محض اس وجہ سے کامیاب نہیں ہوپاتے کہ ان کے بیش قیمت فضلا کی خدمات کی معاشرے میں گنجائش نہیں ہوتی۔

تعلیم کا معاشرے سے بڑا گہرا اور براہِ راست تعلق ہے جو مختصراً یہ ہے کہ تعلیم معاشرے کو مطلوبہ سمت میں نشو ونما کے لئے درکار اَفراد فراہم کرتی ہے۔ اَفراد سے ہی معاشرہ وجود میں آتا ہے اور ان میں تعلیم یافتہ اور باصلاحیت افراد اپنے معاشرہ کو مخصوص سمت ترقی دیتے ہیں۔ لوگ مخصوص پہلو پر اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے اور بعد میں معاشرے میں اپنی خدمات انجام دے کر معاشرتی عمل میں جذب ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی معاشرہ سائنس وٹیکنالوجی کی سمت پیش قدمی کرنا چاہتا ہے تو وہاں سائنس وٹیکنالوجی کے علوم کے ماہرین کی بڑی ضرورت موجود ہوجانے کے سبب بڑی آسانی سے کھپت ہوجاتی ہے اور یہ معاشرہ ایسے ماہرین کو تحصیل علم کے بعد مصروفیت، عزت اور شخصی وعلمی ارتقا کے اِمکانات فراہم کرتا ہے جس کے نتیجے میں اس رخ پر معاشرے کی ترقی ہونا ممکن ہوجاتی ہے۔ ایسا معاشرہ جو دینی اہداف و مقاصد کی بجائے خالصتاً مادی ترقی پر کاربند ہو، تو ایسے معاشروں میں دینی علوم کے ماہرین کی کھپت تو دور کی بات، ان کی صلاحیتوں سے استفادہ بھی نہیں کیا جاتا، یوں اس مخصوص میدان میں ان کی صلاحیتیں پروان چڑھنے سے بھی محروم رہ جاتی ہیں اور معاشرہ اس سمت تنزل کا شکار ہوجاتا ہے۔ ایسی صورتحال میں دینی تعلیم یافتہ حضرات کو حالات پر انحصار کرنے کی بجائے دو میدانوں میں کام کرنا پڑتا ہے، دینی اہداف کی تکمیل کے لئے دینی خدمات اور اپنے معاش کے لئے ایک ایسی متوازی مصروفیت جس کی معاشرہ کفالت مہیا کرتا ہو۔

ایک طرف درگاہ سے سندِ فضیلت کے بعد معاشرہ میں اس کی ضرورت اور گنجائش کا پہلو قابل غور ہے تو دوسری طرف کسی بھی علم کی تکمیل اور اس میں مہارت بھی عملی زندگی میں اسے

اختیار کرنے سے مشروط ہے۔ درسگاہیں تو محض اپنے طلبہ کو کسی علم کا دروازہ کھولنے اور اس فن کے ماہرین کے خیالات سے استفادہ کرنے کی بنیادی صلاحیت پیدا کرتی ہیں۔ درسگاہوں میں حاصل کی جانے والی تعلیم کسی بھی میدان کی مسلمہ معلومات کا نچوڑ ہوتی ہے جس کو عملی زندگی میں اختیار کرنے کے بعد ہی انسان اس کو اپنی شخصیت کا حصہ بناتا، اپنی ذاتی کاوش سے اس میں پختگی لاتا اور حالات کی ضرورت کے مطابق اس میں مزید ارتقائی منزلیں طے کرتا ہے۔ چنانچہ کوئی شخص اگر سائنس کی تعلیم کے بعد عملاً زبان دانی کے کسی میدان کو بطورِ روزمرہ اختیار کرلے تو اس کا سائنس کا علم نہ صرف یہیں تک رک جائے گا بلکہ روز بروز نظر انداز ہوتا جائے گا، یہی صورتحال دینی تعلیم کی بھی ہے۔ تاہم دینی تعلیم کے میدان میں تعلیم حاصل کرنے سے بڑھ کر کہیں سنگین مسئلہ اس تعلیم کا معاشرتی دھارے میں استعمال ہے۔ سینکڑوں لوگ دینی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں لیکن بعد از فراغتِ علم ان کی کاوشوں کا محور کیا ہوگا؟ اس صورتحال سے حیران و پریشان ہوکر آغاز میں ہی لوگ یہ بھاری پتھر اُٹھا کر رکھ دیتے ہیں۔ الغرض دینی مدارس کو اس وقت تحصیل علم اور اس میں مطلوبہ مہارت سے بڑھ کر اپنے فضلا کے مستقبل کی مفید مصروفیت کا سنگین مسئلہ درپیش ہے!!

تعلیم پر معاشرہ کا یہ جبر دورِ حاضر کا ایک مسلمہ ہے۔ ماضی کے سادہ معاشروں میں کسی میدان میں قابل افراد کی تیاری ان کے لئے اس میدان میں ذاتی قابلیت کے بل بوتے پر اپنا راستہ آپ بنانے کا امکان پیدا کردیتی تھی، لیکن جب سے معاشروں کی تشکیل اور رجحانات پر جدید ریاستی اداروں نے غلبہ جمایا ہے اور افرادِ معاشرہ کی چند بنیادی ضروریات کی کفالت کے نام پر تشکیل پانے والا اِدارۂ ریاست، اپنے عوام کے ہر مرحلہ زندگی میں دخل اندازی کرکے، حکومتی اقتدار و اختیار کے بل بوتے پر، معاشرے کے ہر پہلو میں اپنا تسلط گہرا کررہا ہے، تب سے معاشرے پر مخصوص نوعیتوں کے تعلیم یافتہ افراد کو اپنا مطلوبہ معاشرہ خود سے تشکیل دے لینے میں شدید دقت پیش آرہی ہے۔ اور یہ مشکل اس وقت مزید دوچند ہوجاتی ہے جب بین الاقوامی جبر واستعمار اور علاقائی حکومت دونوں کا براہِ راست نشانہ ہمارا دین بن جائے اور اُن کا ہر وار براہِ راست ہماری دینی اساس پر ہو تو ایسے حالات میں مسلمانوں کے معاشرے میں دین کی شدید ضرورت کا احساس ہونے کے باوجود دینی علوم کے ماہرین کے لئے مطلوبہ تقاضوں کے مطابق معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنا مشکل تر بن جاتا ہے۔

معاشرہ کی تشکیل میں باصلاحیت اور صاحبِ علم حضرات اساسی کردار رکھتے ہیں کیونکہ معاشرہ دراصل انہی لوگوں کا نام ہے اور انہی کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ البتہ ریاستی ادارے کی ترقی واستحکام کے بعد قابل افراد کی یہ تیاری فطری ضروریات اور دینی تقاضوں پر منحصر ہونے کی بجائے زیادہ تر ریاستی اقدامات کی ہی مرہونِ منت ہوگئی ہے۔ ریاست پر قابض طبقہ اپنے مخصوص اہداف کے لئے تعلیمی ادارے پروان چڑھاتا اور ایسے فضلا کے لئے ترقی کے امکانات فراہم کرتا ہے جو اس کے مفادات، ضروریات یا نظریات سے ہم آہنگ ہوں۔ اس مقصد کے لئے وہ مقابل میں ایسے بہت سے فضلا کی کھیپ میسر کردیتا ہے جو ریاستی سرپرستی سے بھرپور طور پر متمتع ہوں جس کی وجہ سے ریاست کو قابل اذہان بڑی تعداد میں میسر آجاتے ہیں۔ اور فطری ودینی ضروریات کے تحت معاشرہ کی تشکیل کرنے والے محبِّ دین وملت فضلائے مدارس کے بالمقابل ایسے فضلا زیادہ دُنیوی کامیابی حاصل کرلیتے ہیں۔ الغرض ہر دو قسم کے فضلا کے مابین مخصوص نوعیت کے معاشرہ کی تشکیل کے لئے لگاتار کوششیں ہوتی رہتی ہیں اور دونوں باہم نبرد آزما رہتے ہیں۔

مسلم معاشروں پر سیکولر اثرات

جوں جوں کسی بھی مادی طور پر ترقی یافتہ یا دوسرے الفاظ میں سیکولر معاشرے میں نظم وربط اور استقرار واستحکام بڑھتا جائے گا، توں توں اس معاشرے میں دین کا کام کرنا مشکل تر ہوتا جائے گا۔ دیہاتی (جدید اصطلاح میں 'غیر متمدن') معاشرے جدید شہروں کے مقابلے میں دینی سرگرمیوں کو وسیع تر گنجائش فراہم کرتے ہیں۔ یہ دعویٰ لاہور اور فیصل آباد یا گوجرانوالہ جیسے شہروں میں دینی سرگرمیوں کا تقابل کرنے پر بخوبی واضح ہوسکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی لادین معاشرے میں اہل دین سے توقع رکھے جانے والے تقاضے بھی روز افزوں ہوتے ہیں۔ ان کے لئے اصلاحِ احوال کے اہداف تو روز بروز بڑھتے جاتے ہیں لیکن ان کے پیش نظر مشن میں آگے بڑھنا مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل سادہ یا اسلامی معاشروں میں اہل دین کا اعزاز ووقار اور ان کے لئے کام کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے اور معاشرے کے دیگر ناصر نہ صرف ان کی خدمات کی معاونت کرتے ہیں بلکہ ان ناصر کی بنا پر دینی کام کے تقاضے بھی قابل عمل ہوتے جاتے ہیں۔

اگر آپ معمولی غور وفکر سے کام لیں تو تعلیم اور معاشرے کے بارے میں پیش کردہ ان نظریات کی پاکستانی معاشرے میں کارفرمائی آپ بخوبی محسوس کرسکتے ہیں۔ پاکستانی معاشرہ چند برسوں سے دین اور اہل دین کے لئے روز بروز اجنبی ہوتا جارہا ہے۔ ریاستی اقتدار کے بل بوتے پر گذشتہ برسوں میں اہل دین کو لگاتار اس طرح نشانہ بنایا گیا ہے کہ اس کے پورے معاشرے پر سنگین اثرات مرتب ہوئے ہیں: ایک طرف مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کی تعداد میں خاصی کمی آئی ہے تو دوسری طرف ممتاز ومخلص علما ہمارے معاشرے سے روز بروز عنقا ہوتے جارہے ہیں۔ علم وارشاد کی مسندیں ویران ہیں اور چند برس قبل پائے جانے والے عظیم اساطینِ علم کا شدید فقدان ہے۔ معاشرے کی سیکولرائزیشن کے سبب جوں جوں معاشرے کی حقیقی دینی ضروریات میں اضافہ ہورہا ہے، توں توں مخلص اہل دین ناپید ہورہے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اہل دین کے لئے معاشرے میں مطلوبہ کردار کو پورا کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف بنادیا گیا ہے۔

اگر مسلم دنیا کے معاشروں کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو پاکستان سمیت اس وقت تمام مسلم دنیا کے معاشرے سیکولر بنیادوں پر قائم ہیں اور سعودی عرب ہی وہ واحد سرزمین ہے جہاں اسلامی معاشرت کی بہترین 'میسر مثال' موجود ہے جو عراق میں امریکی تسلط اور شدید عالمی دباؤ کے بعد بڑی تیزی سے رو بہ تنزل ہے۔ مذکورہ بالا اندیشے سعودی عرب میں تاحال شدید نہیں ہوئے اور وہاں کے علماے کرام نہ صرف معاشرے کی مطلوبہ رہنمائی کا فریضہ بخوبی انجام دے رہے ہیں بلکہ ان کی قدر ومنزلت بھی غیر معمولی طور پر مستحکم ہے اور وہ اپنے معاشروں کی قیادت کررہے ہیں۔ اس کے بالمقابل دیگر مسلم دنیا میں حکومتی اقدامات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی دینی صورتحال انتہائی ابتر ہے جس میں اُمید کی واحد کرن ان معاشروں کے افراد بالخصوص نوجوانوں کا ذاتی طور پر دین کی طرف روز بروز بڑھنے والا رجوع ہے۔

فضلاے مدارس کا مطلوبہ معاشرتی کردار

معاشروں کی ہمہ جہتی اصلاح ایک عظیم کام ہے، لیکن ایسا اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک علماے کرام کے مطلوبہ معاشرتی کردار کے بارے میں سنجیدگی سے غور وفکر نہ کیا جائے۔ ماضی میں مسلم سرزمین پر قبضہ کرلینے والے استعمار نے بزورِ قوت ترقی کے نام پر ہمارے معاشروں کو ان کی دینی اساس سے محروم کرکے خالصتاً الحادی بنیادوں پر قائم اور جاری وساری

کردیا اور معاشرتی میدانوں میں اسلامی تقاضوں کو معطل کردیا۔ نتیجتاً مقبوضہ علاقوں کے مسلمان باشندوں نے بھی ان موضوعات پر اپنے دین سے رہنمائی لینا ترک کردی اور یہاں کے علماے کرام بھی اپنے اس محدود کردار پر ہی انحصار کرگئے۔ مسلم ممالک کی آزادی کے ساتھ اس صورتحال میں تبدیلی آنا انتہائی ضروری تھا لیکن دورانِ غلامی ایسا طبقہ وجود میں لایا گیا تھا جو مغربی نظریات کا تربیت یافتہ اور فکرِ الحاد کا اسیر تھا، مزید برآں یہاں سے ظاہری روانگی سے قبل سامراج اپنے ایجنٹوں کو یہاں مسلط کرگیا اور مسلم معاشروں میں مطلوبہ تبدیلی واقع نہ ہوسکی!!

جہاں تک اسلام کی معاشرتی ہدایات کا تعلق ہے تو قرآن وسنت میں فرد کی تربیت و اصلاح کے ساتھ معاشرے کو دین پر قائم کرنے کی ضرورت کو بھی بڑی شدت سے اُجاگر کیا گیا ہے اور اس کے تفصیلی احکامات موجود ہیں۔ مسلمانوں کی سیاست وعدالت، معیشت ومعاشرت اور تعلیم وابلاغ کا کیا منہج ہونا چاہئے، اس کی تفصیلات پر کتبِ حدیث وفقہ میں براہِ راست بیسیوں اَبواب موجود ہیں، اور قابل ذکر امر یہ ہے کہ اسلام کا حقیقی امتیاز اور مروّجہ تہذیب ومعاشرت سے برتری سماجیات (سوشل سائنسز) کے انہی میدانوں میں ہے جس کو مسلم معاشروں میں نسیاً منسیاً کیا جاچکا ہے۔ اسلامی احکامات میں فرد سے ادائیگی فرض کا تقاضا کیا جاتا ہے لیکن اس کی برکات مسلم اجتماعیت ومعاشرت بحال ہونے کی صورت میں ہی حاصل ہوتی ہیں۔ بطورِ مثال صلوۃ وزکوٰۃ ایک انفرادی حکم ہے لیکن ان احکامات کی بجاآوری مسلم معاشرے کو ہمدردی، حسن تعلق اور باہمی کفالت کے کیسے قیمتی رویوں سے روشناس کراتی ہے اور اس کے نتیجے میں مسلم اُخوت کس طرح پروان چڑھتی ہے، ایسا مسلم معاشرت کے نافذ العمل ہوجانے کے بعد ہی پتہ چل سکتا ہے۔ سود، انشورنس اور جوے کی حرمت یا اسلامی عقوبات بظاہر کڑی پابندیاں لگتی ہیں، لیکن اس کے معاشرے پر مثبت اُثرات اہل نظر سے مخفی نہیں!

افسوس کہ ہمارے اہل علم ودین حضرات اس وقت اسی رُشد وہدایت پر قانع ہوئے بیٹھے ہیں جس کی اجازت ہمارے سیکولر معاشروں نے ہمیں دے رکھی ہے۔ اُنہوں نے اسی کردار پر اکتفا کررکھا ہے جو دو رکعت کی امامت کا کردار ان کو ان سیکولر حکومتوں نے عطا کردیا ہے۔ محمد عربی ﷺ کی وراثتِ علمی کے دعویداروں کو تو معاشرے کا قائد بننا تھا، اور یہ قیادت عبادات وعقائد سمیت جملہ معاشرتی میدانوں میں بھی اسلامی احکامات کو زندہ وتابندہ کئے بغیر حاصل نہیں کی جاسکتی۔ ہمیں معلوم ہے کہ رحمۃ للعالمین ﷺ مکہ ومدینہ میں مسلمانوں کی عبادات کے ہی

امام نہیں تھے اور مسلمانوں کے خاندانی معاملات کے فتوؤں تک ہی ان کا کردار محدود نہیں تھا، بلکہ آپ ﷺ کا اصل کارنامہ اس بندگی کے نتیجے میں ایک مسلم معاشرہ کا بھرپور قیام تھا جس کے آپؐ سیاسی، عسکری اور عدالتی سربراہ بھی تھے۔ مسلمانوں کی معیشت اور تعلیم بھی آپ کی ہدایات کے تحت ہوتی تھی، تبھی وہ معاشرے اقامتِ دین کے سبب اللہ کی رحمتوں کے مستحق ٹھہرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ استعماری اقدامات کے نتیجے میں اہل دین کا اس کردار تک محدود ہوجانا جس قدر سیکولرزم میں گوارا ہے، درحقیقت ان اہل دین کا بھی اسلام کی بجائے سیکولر تصورات پر عمل درآمد کرنے اور اس پر اکتفا کرنے کا نتیجہ ہے۔ ہم لوگ سیکولرزم پر تنقید کرتے نہیں تھکتے لیکن خود اسی 'سیکولر رویہ' پر عامل اور کاربند ہیں۔

سیکولرزم کے دیے ہوئے نظامِ تعلیم کے فی الوقت دو اساسی دھارے ہیں: ایک سکول سسٹم اور دوسرا مدرسہ نظامِ تعلیم، اور دونوں کے تیارشدہ فضلا جس جس دائرۂ عمل میں کام کررہے ہیں **وہ سیکولر نظام معاشرہ کے ہی عطا کردہ ہیں۔ یہ دونوں نظامِ تعلیم اس وقت دین ودنیا کی تفریق پر** کاربند ہیں۔ اگر کوئی جدید تعلیم حاصل کرتا ہے تو وہ معاشرہ کے دنیوی تقاضے پورے کرنے اور اپنی دنیا سنوارنے میں مگن ہوجاتا ہے، اور اگر کسی کو دینی علم حاصل کرنے کی توفیق ارزانی ہو جائے تو وہ مساجد کی امامت وخطابت کے علاوہ، اس حد تک لوگوں کی دینی رہنمائی کا منصب سنبھال لیتا ہے جہاں تک سیکولر وملحد معاشرت نے دنیا بھر میں اجازت دے رکھی ہے اور وہ ہے زندگی کی اہم رسوم ورواج اور عبادات (پرائیویٹ لائف) کو اپنے دین کے مطابق گزارنا۔ گویا ایک گروہ فرنگی معاشرت میں کھوگیا اور دوسرا تہ محرابِ مسجد سوگیا۔ اگر چند بچے کھچے لوگ نظام معاشرت میں اصلاح کی کوشش کرتے بھی ہیں تو حکومتی وریاستی مشینری اور جابرانہ اقدامات سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ سوات میں نفاذِ عدل کی تحریک کا انجام ہمارے سامنے ہے!

مسلم حکومتوں کا ظالمانہ رویہ

افسوسناک امر تو یہ ہے کہ اسلام جو مسلمانوں میں عمل واقدام کی قوی ترین تحریک ہے، اور جو ہر معاملے کو عمل سے منسلک کرکے ہمیں بہترین نتائج کا وعدہ دیتا ہے، اسے ہمارے 'مسلم معاشرے' میں محض تعلیم وتعلّم کا پیشہ بنادینے تک محدود کردیا گیا ہے۔ دینی مدارس کے فضلا ہوں یا سرکاری تعلیمی اداروں کے شعبہ ہائے علومِ اسلامیہ کے سند یافتگاں، ہر دو کے فضلا کی علمی

کاوشوں کا کل ارتکاز ان علوم کی مزید تعلیم تک ہی منحصر ہے اور دیگر مغربی علوم کے بالمقابل عملی میدان میں اُنہیں کھپانے کی کوئی گنجائش میسر نہیں ہوتی۔ قانون ومعیشت کی جدید تعلیم حاصل کرنے والے فضلا تو نہ صرف عملی زندگی میں اس علمی صلاحیت کی بنا پر متعدد مصروفیات اختیار کرسکتے ہیں بلکہ مزید تعلیم کے لئے تدریس کے شعبے سے بھی وابستہ ہوجاتے ہیں، اس کے بالمقابل مدارس کو تو ایک طرف چھوڑیئے، یونیورسٹی یا کسی سرکاری کالج کا علوم اسلامیہ کا سند یافتہ علوم اسلامیہ کے ہر پہلو پر حاصل کردہ اپنے علم کا مصرف اس سے زیادہ نہیں پاتا کہ وہ ان کی آگے مزید تدریس کرسکے۔ کسی علم کو تدریس تک ہی محدود کردینا اور معاشرتی عمل میں استعمال میں نہ لانا اس رویہ کا غماز ہے کہ ارباب اختیار کے پیش نظر محض اس کا تحفظ و وجود ہی مطلوب ہے، نہ کہ اس کی بنا پر اپنی اجتماعی وانفرادی زندگیوں کی تشکیل کرنا؛ یہی وجہ ہے کہ اس حد تک علوم اسلامیہ غیر مسلم ممالک کے تعلیمی اداروں میں بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ اسلام کو عملی ومعاشرتی تشکیل سے نکال کر محض تعلیم وتعلّم تک محدود کردینا انتہائی ظالمانہ رویہ ہے!!

آج دین ودنیا کی جس تفریق کا رونا رویا جاتا ہے اور اس کی وجہ دو نظام ہائے تعلیم کو قرار دے کر، اُنہیں باہم متصادم باور کیا جاتا ہے، درحقیقت اس کی وجہ ان نظام ہائے تعلیم سے کہیں زیادہ ان ریاستی اقدامات میں پوشیدہ ہے جو طبقہ اختیار نے سیکولر تصورات کی بنا پر بزورِ جبر لاگو کر رکھے ہیں۔ دین ودنیا کے یہ دو واضح دائرے نہ تو ہمارے علمی اداروں کا فیض ہیں اور نہ ہی ہمارے دین کی عطا بلکہ ہمارا دین تو اسلام کی بنا پر زندگی کے ہر مرحلے کو تشکیل دینے کا پرزور داعی ہے جس کے نتیجے میں کسی مسلمان کا دین کی روشنی میں دُنیوی زندگی کی اصلاح کے لئے اُٹھایا جانے والا ہر قدم بھی آخرکار دین ہی ٹھہرتا ہے۔ اس بنا پر ہمارے سنجیدہ فکر حضرات کو ظاہری علامتوں کی بجائے نام نہاد مسلم معاشروں کی عمرانی ساخت اور اس کو قائم کرنے کے لئے حکومتی اقدامات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

نصاب میں ترمیم یا معاشرہ کی اسلامی تشکیل؟

اس سلسلے میں محض دینی مدارس میں سماجیات کی تعلیم ہی مسئلہ کا حل نہیں جیسا کہ بعض اہل دانش کا خیال ہے بلکہ موجودہ منظم ومنضبط معاشرہ کی اسلامی تشکیل اور اس کو اسلامی تقاضوں کے مطابق اُستوار کرنا ہوگا۔ کیونکہ دینی مدارس کے طلبہ کو جدید وسماجی علوم کی تربیت دے بھی دی

جائے تو اس کے باوجود اُنہیں ان نئے میدانوں میں اپنا راستہ خود بنانا پڑتا ہے اور ان کی تمام تر کاوش نظریاتی میدان سے آگے نہیں بڑھ پاتی کیونکہ معاشرے میں اس کے بالمقابل متوازی ملحد تصورات کارفرما ہوتے ہیں۔ یہ مسئلہ صرف دینی مدارس کا نہیں بلکہ سرکاری تعلیمی اداروں سے اسلامیات پڑھنے والے فضلا بھی اسی صورتحال سے دوچار ہیں کہ وہ پہلے سے طے کردہ ایک مخصوص کردار کے ہی اَسیر بن کر رہ جاتے ہیں۔ معاشرہ کی اس سیکولر تشکیل کا نتیجہ ہے کہ ماضی کی اسلامی یونیورسٹیاں ہو یا دورِ حاضر کی، آخرکار اسلامی کورسز کو چھوڑ کر وہ بھی مادی ترقی کے مغربی علوم میں پناہ حاصل کرنے پر اس لئے مجبور ہیں کیونکہ فضلاے علومِ دینیہ کے لئے معاشرے میں انتہائی محدود کردار تجویز کیا گیا ہے۔

ان حالات میں محض تعلیم دے کر فضلا سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنا راستہ خود تشکیل دے لیں گے، ایک مشکل امر ہے۔ بلکہ ایسی امتزاجی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ ہر دو مروّجہ نظامہاے تعلیم کے فضلا سے بھی اجنبیت کا عذاب سہتے ہیں اور اکثر وبیشتر مطلوبہ راستہ آخرکار ترک کر دیتے ہیں۔ اپنا راستہ خود بنانے والے اور اس پر جم جانے والے لوگ ہزاروں میں کہیں ایک دو ہوتے ہیں جو اپنی داخلی صلاحیتوں کے باوصف دین ودنیا میں امتزاج کی تکلّفانہ مساعی کو بروئے کار لاتے ہیں، وگرنہ معاشرے میں اس کے حقیقی امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ سکول وکالج کے فضلا کی اپنے میدان میں کھپت اور مسجد ومدرسہ کی اپنے مخصوص میدان میں کھپت کے امکانات تو بہت واضح ہیں۔ لیکن دونوں میں جامعیت جو ہمارے معاشروں کی اصل ضرورت ہے، اس کے حامل لوگ حالات کے جبر کے تحت آخرکار پھر کسی مروّج سماجی ڈھانچے میں ہی جذب ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اس سیکولر تقسیم کے سبب اوّل الذکر نظامِ تعلیم کا دائرۂ عمل پورا معاشرہ ہے، نتیجتاً فضلا کی ایک بہت بڑی ضرورت ہر میدان میں موجود رہتی ہے، جبکہ ثانی الذکر کے لئے بچا کھچا عوام کا پرائیویٹ مذہبی خانہ ہے، جس میں اُنہیں اپنی تمام مساعی بروئے کار لانا ہوتی ہے، نتیجتاً محض نظامِ عبادت اور رسوم ورواج کے لئے فضلا کی نہ صرف ایک محدود تعداد ہی کافی ہے، بلکہ اس کے نتیجے میں معاشرے میں دین ودنیا کی ثنویت بھی مستحکم وبرقرار ہی رہتی ہے۔ اگر آج ہمارے معاشروں میں اسلام کو اختیار کرلیا جائے یا لوگوں میں اِلحادی معاشرے کی اساسات کو تبدیل کر دینے کی صلاحیت پیدا ہوجائے تو مسلم معاشرت کے ہر میدان میں علومِ اسلامیہ کے فضلا کی ضرورت اس قدر روز

فزوں ہوجائے کہ ملک میں موجود تمام تعلیمی ادارے بھی اس ضرورت کو فوری طور پر پورا کرنے پر قادر نہ ہوں جیسا کہ سعودی معاشرے میں علوم اسلامیہ کی یونیورسٹیاں پورے ملکی یونیورسٹیوں کا نصف سے بھی زائد ہیں اور ان کے فضلا کی کھپت کا کوئی مسئلہ ہی درپیش نہیں بلکہ لگاتار مزید کی ضرورت برقرار ہے۔

مدارس کے فضلا کے کردار کی محدودیت کا آج رونا پیٹا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ ہر سال فارغ ہونے والے اتنے سارے فضلا کیونکر معاشرے میں جذب ہوسکیں گے اور اس کے نتیجے میں ان کی دینی تعلیم کو محدود کرنے کی تلقین کی جاتی ہے، تو یہ بھی دراصل اسی سیکولرزم پر اعتماد اور درپیش حالات پر مطمئن ہوکر بیٹھ جانے کی تلقین ہے۔ یہ بات درست ہے کہ متروک راستوں کو دوبارہ زندہ کرنا اور اُسوۂ حسنہ سے روشنی پاکر اپنا کردار متعین کرنا ایک محنت طلب کام ہے، لیکن اس کے بغیر مطلوبہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی مدارس میں عبادات، باہمی اختلافات اور مذہبی رسوم ورواج کی تعلیم پر اکتفا کرنے کی بجائے پورے اسلام کی تعلیم دی جائے اور یہاں کے فضلا کو نبی اکرم ﷺ کے مکمل شخصی اور اجتماعی کردار سے روشناس کرایا جائے، انؐ کے منہج اصلاح کی تربیت دی جائے، دعوت واصلاح کی دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کرنے کی مشق کرائی جائے۔ یہ گھمبیر مسئلہ دینی تحریکوں اور مسلم حکومتوں ہر دو کی توجہ اور اصلاح کا متقاضی ہے۔ تعلیمی اداروں کو بھی اپنی تعلیم وتربیت کو ہمہ گیر کرنا ہوگا اور مسلم حکومتوں کو بھی کافرانہ معاشرت سے ممتاز ہوکر اسلامی معاشروں کو قائم کرنے کی کوشش کرنا ہوگی۔

جہاں تک اس مسئلہ کا شرعی پہلو ہے تو اس کی رو سے بھی علما کی ضرورت اس وقت تک شرعاً محدود نہیں کی جاسکتی جب تک معاشرے میں غلبہ دین حاصل نہیں ہوجاتا۔ مسلم معاشرے کی دینی ضروریات کی کفالت اور تکمیل پوری مسلم اُمہ پر اصلاً فرضِ عین ہے۔ یہ فرض چند ایسے اہل افراد کی اس مشن پر کارفرمائی کے بعد رفع ہوکر فرضِ کفایہ بن جاتا ہے جو اُمت کو مطلوب رہنمائی دے لیں، بصورتِ دیگر یہ فرض تمام اُمت پر قائم رہتا ہے۔ اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہمارے معاشرے دین کے مطلوبہ معیار کو پہنچنا تو درکنار، روز بروز بڑی تیزی سے تنزل کی طرف گامزن ہیں، ایسے میں فضلاے مدارس کی تعداد کم کرنے کی تلقین کی بجائے، ان کی اہلیت کو بہتر کرنے اور معاشرہ کا قبلہ درست کرنے کی ضرورت ہے، وگرنہ دین ودنیا کی یہ تفریق ہی ہمارا مقدر رہے گی اور ذلت وادبار کے سوا مسلم معاشروں کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

عزمِ مصمم اور جہدِ مسلسل!

'اِلحادی معاشروں' سے اہل دین کو اَزخود کچھ نہیں مل جایا کرتا اور نہ ہی اس کی توقع رکھنے کی ضرورت ہے۔ علومِ اسلامیہ کے فضلا کو ہردم یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی بھی معاشرہ ٹھنڈے پیٹوں اسلامی نظام پر استوار نہیں ہوجاتا، دوسرے لفظوں میں حکمرانی سے متمتع ہونے والا طبقہ بہ سہولت یہ اقتدار اپنے ہاتھ سے نکال کر اللہ اور اس کی شریعت کے حوالے نہیں کردیتا جس کی تعبیر و تشریح حکمرانوں کی بجائے ماہرین شریعت کا اِستحقاق ٹھہرتی ہے اور جس کے فیصلے بھی حکمرانوں کے قانون کی بجائے اللہ کی طے کردہ میزان پر ہوتے ہیں بلکہ اس کے لئے آغاز میں ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد سے گزرنا پڑتا ہے اور خونِ جگر سے قربانیوں کی داستان رقم کرنا پڑتی ہے۔

نبی اُمی ﷺ کے علمی و عملی ورثا کو دعوتِ نبویؐ کے مراحل کو ہردم تازہ رکھنا چاہئے جب مکہ کے گردوپیش میں آپ ﷺ نے اس دعوت کا علم لہرایا تو طبقہ حکمران نے لالچ واقتدار سے لے کر قہر وجبر کا ہر سخت سے سخت رویہ اختیار کیا، طائف سے مظلومانہ دربدری ہو یا مکہ میں شعب ابی طالب کی گھاٹیاں، قتل کی سازشیں ہوں یا طعن واَذیت کے نت نئے طور طریقے، اسی عظیم مقصد کو پانے اور اللہ کے دین کو خود اور اپنے معاشرے پر نافذ کرنے کا عزم لے کر اُٹھنے والے صحابہ کرامؓ کو وطنِ مالوف سے ہجرتیں کرنا پڑیں، اپنے مولد و وطن، کاروبار اور خویش و اَقارب چھوڑ کر اللہ کی آس پر نئی دنیا تخلیق کرنا پڑی، تب پہلی بار تاریخ میں لاکھوں قربانیوں کے بعد اسلام زندگی کے ہر میدان میں نافذ ہوا۔ بعدازاں تیرہ صدیوں تک کسی نہ کسی شکل میں، کم وبیش اس کا نفاذ برقرار رہا، جسے جدید تہذیب واستعمار نے سیاسی جبر کی قوت پر اپنی اساسات سے اُکھیڑنے میں کامیابی حاصل کی اور ذلت ورسوائی مسلمانوں کے مقدر میں لکھ دی۔ ادارۂ خلافت کا سقوط ہو یا اسلام کے نظامِ عدل کا کلی خاتمہ، ایسا سنگین مرحلہ مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بار آیا۔

اب پورے دین کو نافذ کرنے کے لئے عزمِ پیہم اور جہدِ مسلسل سے گزرنا ہوگا۔ یہ داستانِ عزم ووفا بڑی دشوار گزار اور قربانیوں کی متقاضی ہے، جب تک اس مشن کے حامل و وارث علم وعمل سے مزین ہوکر مخلصانہ اور مشترکہ مساعی بروئے کار نہیں لائیں گے، اس وقت تک اُنہیں مطلوبہ نتائج کی توقع بھی نہیں رکھنا چاہئے۔ معاشرتی میدانوں میں مدارس دینیہ کی شکل میں اسلامی تعلیم کا مضمحل ادارہ ہو، یا جہادی تحریکوں کی شکل میں جہاد کی بچی کھچی صورتیں، یہ دونوں

معاشرتی مظاہر اس وقت عالم کفر کا سب سے بڑا مسئلہ ہیں اور اِنہی سے مسلم اُمہ کے احیا کی تحریک پھر سے زندہ ہوسکتی ہے۔ کتاب وسنت کو سیکھنے سکھانے والے کسی وقت اُمت کے رجوع الی القرآن کا سبب بن سکتے ہیں اور کفر کے سامنے مزاحمت کرنے والے کسی وقت اُمہ کی سوئی ہوئی غیرت وحمیت کو جگا کر اپنے ساتھ کھڑا ہونے پر اُنہیں آمادہ کرسکتے ہیں۔

مغرب کا اساسی نظریہ؛ دین ودنیا کی تفریق

اس موضوع کے اختتام سے قبل یہ یاددہانی ضروری ہے کہ معاشرے کی دو سب سے بنیادی طاقتیں ہیں، ایک مذہب اور دوسری ریاست۔ مذہب کو دیگر علوم کے مساوی ایک معمولی حیثیت دینا اس کے مقام سے انحراف ہے بلکہ مذہب انسان کا پہلا حوالہ اور اس کی ہر لحہ کی شناخت ہے۔ یہی کسی قوم کا بنیادی تعارف ہے اور اسی بنا پر ہمیشہ سے عسکری جارحیتیں ہوتی رہیں اور آج بھی ہورہی ہیں۔ مذہب ہی دین ودنیا کی کامرانی کا محور ہے۔ اس بنا پر مذہب کو محض ایک علمی حوالہ بنا دینا یا معاشرے میں دیگر میدانوں کی طرح اس کو بھی ایک دائرۂ کار تک محدود کردینا الحادی معاشرہ کی سنگین زیادتی ہے۔ مغرب کی نام نہاد 'احیاے علوم کی تحریک' دراصل مذہب سے اِنحراف کی تحریک ہے جس کی اساس علوم کو وحی واِلہام سے منقطع کرکے تجربہ ومشاہدہ پر قائم ودائم کرنا (سائنس ومذہب کا معرکہ) اور اس کے لازمی نتیجے کے طور پر انسانوں کو اللہ کی بندگی سے نکال کر ذاتی خواہشات ومفادات کا اَسیر بنانا ہے۔ مغرب میں اس تحریک کی منطقی ضروریات اور اَسباب ایک علیحدہ موضوع ہیں، لیکن اس کے لازمی نتیجے کے طور پر مذہب کو اجتماعی دائروں سے نکال باہر کیا گیا، تاہم مذہب کی اس غیر معمولی اہمیت کی بنا پر جدید تہذیب کے فکری کارپردازان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ اس کو کلی طور پر انسانوں کی زندگی سے خارج کردیا جاتا کیونکہ نہ صرف یہ ہر انسان کی فطرت کا بنیادی تقاضا ہے بلکہ اس سے انسان کا عمرانی رشتہ بھی صدیوں پرانا ہے۔ اس بنا پر مذہب وریاست میں مفاہمت کا یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ مذہب کو فرد کی ذاتی زندگی کی حد تک اختیار کرنے کو گوارا کیا جائے جہاں وہ دوسرے شخص کے ساتھ تعلقات میں مخل نہ ہو اور معاشرتی میدان میں اس کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے کیونکہ یہ ریاست کا دائرۂ عمل ہے۔ یہی دین ودنیا کی تفریق (سٹیٹ اور چرچ میں جدائی) ہے جس کا طعنہ دینی مدارس کو دیا جاتا ہے جبکہ درحقیقت یہ سیکولرزم کا اَساسی نظریہ ہے۔ اس طرح انسانوں کی

حاکمیت اور اللہ کی حاکمیت کے مابین ایک حدِ فاصل اور اپنے تئیں مفاہمت کرا دی گئی اور اس کے بعد سے مغربی فکر ونظریہ کی بنا پر قائم ہونے والی تمام دنیا اسی نظریے کی عملی تطبیق بن گئی۔

یہ نظریہ مغرب کا اساسی اور مستحکم ترین نظریہ ہے جس کی داخلی ضرورت یہ ہے کہ اس طرح حکمران طبقہ کی حاکمیت بھی برقرار رہتی ہے اور مذہب کو برقرار رکھنے کا دعویٰ کر کے اللہ کی حاکمیت کو محدود کرنے کا موقع بھی اُنہیں مل جاتا ہے۔ دنیا بھر حتیٰ کہ مسلم دنیا میں بھی مذہب کی بنا پر مسلم معاشرت کو جاری وساری کیوں نہیں کیا جاتا، اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ اس سے انسانوں کی حاکمیت پر قدغنیں لگ جاتی ہیں اور اُنہیں بھی اللہ کے احکامات کے تابع ہونا پڑتا ہے، کیوں کہ یہ اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکمران طبقہ اپنی من مانی اور حکومت کے تحفظ کے لئے کسی بھی مسلم معاشرے میں اسلامی اساسات کو استحکام دینے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ اگر سعودی معاشرہ میں آج اس کے برعکس ایک مثال موجود ہے تو اس کا ایک طویل تاریخی پس منظر اور ان پر یہ اللہ کی خاص رحمت ہے جبکہ سعودی حکمران معاشرے میں شریعت کی عملداری اور علما کی قدر ومنزلت سے خائف رہتے اور اس بنا پر عوامی عتاب کا نشانہ بھی بنے رہتے ہیں کیونکہ اسلامی معاشرے کا محور ایک انسان (حکمران/بادشاہ) یا متعدد انسانوں (جمہوریت) کی حاکمیت کی بجائے فقط ایک اللہ وحدہ لاشریک کی بندگی ہے جس کا حکمران (خلیفہ) بھی پابند ہوتا ہے۔

الغرض سیکولرزم مغربی تہذیب کا سب سے خطرناک وار ہے جس میں حد بندی کے نام پر زندگی کے وسیع تر دائرے کو مذہب کی حاکمیت سے نکال کر ریاست کے نام پر انسانوں کے کنٹرول میں دے دیا گیا ہے۔ ہمارے نظامِ تعلیم بھی اسی ریاستی جبر واستبداد کا شکار ہیں اور ان کے فضلا اسی ریاست کے طے کردہ ڈھانچوں کے رہین واسیر ہیں۔

دنیا آج سیکولرزم کے نظریے کے سحر میں ڈوبی ہوئی ہے، اور اس کو ایک بڑا متوازن ومہذب اور رواداری ومفاہمت پر مبنی توازن قرار دیتی ہے۔ اگر تو دنیوی سہولت اور عیش پرستی مطمحِ نظر ہوں تو ممکن ہے کہ سیکولرزم دنیوی مسائل میں کمی کر سکے، البتہ اگر دنیا میں آمد کا مقصد اللہ کی بندگی اور آخرت کی تیاری ہو، تب سیکولرزم دنیوی تعیش سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یوں بھی دنیا کے لاکھ دعوے کے باوجود آج بھی انسانیت مذہب کی بنا پر ہی عالمی طور پر منقسم اور باہم نبرد آزما ہے۔ الکفر ملة واحدة آج بھی دنیا کی ایک مسلمہ حقیقت بن کر اُمت مسلمہ اور اس کے وسائل کو ہڑپ کرنے کے درپے ہیں۔ ان حالات میں اس بودے دعوے کی کیا گنجائش رہ

جاتی ہے۔ یوں بھی سیکولرزم مسلم اُمہ کو کبھی راس نہیں آیا، چودہ صد سالہ تاریخ اس کے خلاف ایک مستحکم دلیل ہے کہ کامیابی نے ہمیشہ اس وقت مسلمانوں کے قدم چومے ہیں، جب اُنہوں نے ہر میدان میں اپنے دین کو گلے لگایا، نظریۂ جہاد کو اپنایا اور اللہ کی بندگی اختیار کی۔ مسلمانوں کی بہترین اور فلاحی ریاستیں آج اور ماضی میں بھی اللہ کی بندگی پر کاربند رہ کر ہی مثالی ریاستیں قرار پائیں، آج اِنہی خلافتوں کے اِحیا کو ہر مسلمان تڑپتا ہے۔ جبکہ کفار نے اپنے منحرفہ مذاہب پر عمل کر کے، جو الہامی کتابوں میں تحریف کے بعد دراصل ان کے اَحبار و رہبان کی خواہشات تھیں، تاریخ کے ہر موڑ پر ذلت و رُسوائی اُٹھائی ہے اور آج بھی ایسے مذہب سے جان چھڑا کر یہودی و عیسائی ایک محدود دنیوی غلبہ اور کامیابی سے متمتع ہو رہے ہیں اور ہم اپنے مذہب کو ترک کر کے ذلیل و رسوا ہیں۔ صدیوں کی اس مستحکم شہادت کے باوجود بھی کوئی مسلمان کیونکر سیکولرزم کا شیدائی ہو سکتا ہے۔ ہمارا ماضی اور حال دین اسلام کے عین منزل من اللہ ہونے کی اہم ترین دلیل ہے!!

جدید دنیا کا یہ عظیم 'نعرۂ سیکولرزم' آج ہمارے معاشروں کا اہم ترین مسئلہ ہے، جو مذہب کی نفی کی بجائے مذہب کو انتہائی محدود تر کر دینے کا فلسفہ ہے، نہ صرف اسلام بلکہ تمام مذاہب کو ایک مخصوص دائرہ میں مساوی مقام و حیثیت دینے کا نظریہ ہے۔ معاشروں کی تعمیر معاشروں کے اہل علم و فضل کرتے ہیں، اسی لئے آج اس نظریہ کے خلاف کام کرنے والی درسگاہیں اور ان کے فضلا پریشان ہیں، لیکن آخر کار محمد عربی ﷺ کے ورثا کو کتاب و سنت کی الہامی ہدایت اور روحانی قوت کو ہاتھ میں لے کر معاشروں کو اپنی اساسات پر لانے کے لئے جدوجہد کرنا ہوگی، ان چیزوں کو سیکھ کر مسلم عوام کو اس کی تلقین کرنا اور اپنے ساتھ ملانا ہوگا۔ یہ منزل اجتماعی کاوش سے آسان تر ہو جائے گی، وگرنہ راستہ یونہی دشوار گزار اور کٹھن رہے گا اور ہماری بہترین مساعی کے باوجود معاشرہ روز بروز گمراہیوں کے اندھیرے غار میں اُترتا جائے گا۔

پس چہ باید کرد؟ مسلم معاشرہ کو اس کی اصل اساسات پر جن پر نبی کریم ﷺ قائم کر گئے تھے اور جسے مغربی تہذیب سے قبل کوئی فکری، نظریاتی یا عسکری قوت تہ و بالا نہ کر سکی تھی، لوٹانے کے لئے صرف علمی تحریک ہی کافی نہیں۔ اسی مقصد کے لئے معاشرے میں اصلاحی، سیاسی اور جہادی قوتیں بھی کارفرما ہیں۔ جن کا نظریہ ہے کہ مطلوبہ معاشرہ کی تشکیل اس دور میں فکر و نظر، تعلیم و تلقین اور بحث و مباحثہ کی بجائے مراکزِ قوت کی اصلاح اور ان پر قبضہ و اقتدار جمانے کے بعد ہی ممکن ہوگی۔ اس باب میں متعدد نظریات موجود ہیں لیکن اس امر میں کوئی شبہ

نہیں کہ ہر نوعیت کے اِقدام سے قبل تحقیق و تعلیم کا مرحلہ آتا ہے۔ جس طریقے سے بھی یہ مقصد حاصل ہوجائے، حالات کے تحت وہی اُسلوب اس کے لئے موزوں تر ہے۔ البتہ بزورِ جبر اس کو تمام لوگوں پر نافذ کرنے کی بجائے مخلص اور متدین حضرات پر مبنی محدود معاشرے کا قیام اس کا محتاط ترین طریقہ ہے اور فی الوقت یہی طریقہ دنیا بھر میں مختلف نظریاتی گروہوں نے اختیار کررکھا ہے لیکن اس کے لئے آغاز میں جہدِ مسلسل اور بے دریغ قربانیوں کی ضرورت ہے۔ جوں جوں یہ معاشرہ وسیع تر ہوتا جائے گا، اس کو برقرار رکھنا آسان اور اس کے فوائد وسیع تر ہوتے جائیں گے اور اس معاشرے کی تشکیل کتاب وسنت کے حاملین کے ہاتھوں ہی ہوں گی جس میں دین کی تعلیم اور نبی ﷺ کی وراثتِ علمی کی حفاظت اعلیٰ ترین اعزاز ٹھہرے گی۔

دینی مدارس تو نہ عام درسگاہوں کی مثل ہیں اور نہ ہی مستقبل کا کوئی وظیفہ ان کا مطمحِ نظر ہے جو معاشرہ اُنہیں فراہم کرے۔ یوں بھی کوئی شخص محض تعلیم سے ہی انبیا کی وراثت پر فائز نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کیلئے خصوصی مجاہدہ اور تربیت کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے فضلاے مدارس کو عام فضلا کی طرح معاشرہ سے توقعات وابستہ رکھنے کی بجائے اپنی اعلیٰ ترین منزل کیلئے بہترین مساعی بروئے کار لانا چاہئیں، اپنے علم وشعور کو بہتر سے بہترین کرنا چاہئے اور اس جادۂ حق کے 'سابقون اوّلون' بن کر عظیم ترین منزل کی طرف پیش قدمی کرنا چاہئے۔ (ڈاکٹر حافظ حسن مدنی)

ادارہ تحقیقات اسلامی اِسلام آباد کے زیراہتمام

سہ روزہ سیمینار

جنوبی ایشیا میں اسلامی قانونی فکر اور ادارے

مؤرخہ: یکم تا ۳/ اگست ۲۰۰۹ء

مقام: بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، فیصل مسجد کیمپس، اسلام آباد

سیمینار کے محاور

- فقہ اور اُصولِ فقہ میں جنوبی ایشیا کا ورثہ
- جنوبی ایشیا میں تدریس فقہ
- جنوبی ایشیا میں افتاء کا ارتقا
- جنوبی ایشیا میں نظامِ قضا
- جنوبی ایشیا کے فقہی ادارے
- فقہائے جنوبی ایشیا
- جنوبی ایشیا میں اسلامی قانون سازی
- جنوبی ایشیا کا نظام احتساب

اَحکام وشرائع

محمد ارشد کمال

رمضان المبارک کے فضائل واَحکام

رمضان المبارک کا سارا مہینہ ہی برکتوں والا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے شہر مبارك کہا ہے جیسا کہ سیدنا ابوہریرہؓ یہ فرمان نبویؐ بیان کرتے ہیں:

«أتاكم رمضان، شهر مبارك، فرض الله عزوجل عليكم صيامه، تُفْتَح فيه أبواب السماء وتُغْلَق فيه أبوابُ الجحيم، وتُغَلُّ فيه مَرَدَةُ الشَّياطين، لله فيه ليلةٌ خير من ألف شهر من حُرِم خيرَها فقد حُرِمَ»

(سنن نسائی:۲۱۰۶ صحیح)

''تمہارے پاس رمضان کا بابرکت مہینہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے تم پر فرض کئے ہیں۔ اس میں آسمان کے دروازے کھول دیے اور جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں۔ سرکش شیاطین بھی جکڑ دیے جاتے ہیں۔ اس ماہ میں ایک ایسی رات بھی ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے جو کوئی اس کی خیر و بھلائی سے محروم کردیا گیا تو وہ (ہر خیر سے) محروم کردیا گیا۔''

سحری میں برکت

سیدنا انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«تَسحَّروا فإن في السحور بركة» (صحیح بخاری:۱۹۲۳)

''سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہوتی ہے۔''

سیدنا عرباض بن ساریہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے رمضان میں سحری کے لیے بلایا اور فرمایا: «هلمَّ إلى الغداء المبارك» (سنن ابوداؤد:۲۳۴۴ صحیح)

''آؤ، برکت والا کھانا کھالو''

ماہ رمضان میں تمام مسلمان اُنتیس یا تیس دن بلاناغہ سحری کھاتے ہیں۔ اس لحاظ سے رمضان کے پورے مہینے میں مسلسل برکتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے۔

افطاری کی کھجور میں برکت

سیدنا سلمان بن عامرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إذا أفطر أحدكم فليفطر على تمر فإنه بركة فإن لم يجد تمرًا فالماء فإنه طهور» (سنن ترمذی: ۶۵۸ صحیح)

''جب تم میں سے کوئی (روزہ) افطار کرے تو وہ کھجور سے افطار کرے، کیونکہ وہ باعث برکت ہے۔ اگر کھجور نہ ملے تو پھر پانی سے افطار کرے کیونکہ وہ باعث طہارت ہے۔''

ماہِ رمضان میں مسلسل سحری و افطاری کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور افطار کے وقت کھجور بھی خوب کھائی جاتی ہے۔ لہٰذا پورے مہینے میں صبح و شام مسلسل برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔

برکت والی رات

اِرشادِ باری تعالیٰ ہے

﴿حٰمٓ، وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ، اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ﴾ (الدخان: ۱تا۳)

''حم۔ اس وضاحت والی کتاب (قرآن) کی قسم! یقیناً ہم نے اسے بابرکت رات میں نازل فرمایا، بے شک ہم ڈرانے والے ہیں۔''

یہاں بابرکت رات سے مراد لیلۃ القدر ہے جیسا کہ قرآنِ مجید میں دوسرے مقام پر یوں صراحت ہے: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (القدر: ۱)

''بے شک ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا۔''

ایک مقام پر یوں صراحت فرما دی: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ: ۱۸۵) ''ماہِ رمضان وہ (مہینہ) ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔''

ان آیات سے پتا چلا کہ قرآن مجید ماہ رمضان ہی کی ایک برکت والی رات یعنی لیلۃ القدر میں اتارا گیا اور لیلۃ القدر رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات ہے۔

شبِ قدر کے بابرکت ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے کہ ایک تو اس میں قرآن کا نزول ہوا۔ دوسرے، اس میں فرشتے اور روح الامین کا نزول ہوتا ہے۔ تیسرے، اس میں سارے سال

میں ہونے والے واقعات کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ چوتھے، یہ رات ہزار مہینے سے بھی افضل ہے۔ پانچویں، یہ رات صبح ہونے تک سلامتی ہی سلامتی ہے۔

ثواب میں برکت

رمضان المبارک میں کئے ہوئے نیک اعمال کے ثواب میں بھی بہ نسبت دوسرے مہینوں کے اضافہ اور برکت ہوتی رہتی ہے۔ سیدنا ابن عباس کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری خاتون سے پوچھا: تو نے ہمارے ساتھ حج کیوں نہیں کیا؟ وہ کہنے لگی کہ ہمارے پاس صرف دو ہی اونٹ تھے۔ ایک پر میرا خاوند اور بیٹا سوار ہوکر حج کرنے چلے گئے جبکہ دوسرا اونٹ ہمارے لیے چھوڑ گئے جس پر ہم پانی لاتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: «فإذا جاء رمضان فاعتمري فإن عمرة فيه تبدل حجة» (صحیح مسلم:۱۲۵۶)

''جب رمضان آئے تو عمرہ کرلینا کیونکہ رمضان کا عمرہ (ثواب میں) حج کے برابر ہے۔''

نیز سیدنا وہب بن خنبش، ابو معقل اور سیدنا جابرؓ سے بھی یہی مروی ہے کہ

"عمرة في رمضان تعدل حجة" (سنن ابن ماجہ: ۲۹۹۱، ۲۹۹۳، ۲۹۹۵ صحیح)

''رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے۔''

امام ابن جوزیؒ فرماتے ہیں: فيه أن ثواب العمل يزيد بزيادة شرف الوقت كما يزيد بحضور القلب وبخلوص القصد (فتح الباری:۳/۷۶۳)

''اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح حضور قلب اور اخلاص نیت کی بنا پر عمل کا ثواب بڑھ جاتا ہے اس طرح مبارک وقت کی مناسبت سے بھی عمل کا ثواب بڑھ جاتا ہے۔''

رمضان المبارک کے فضائل

ماہِ رمضان فضائل کے باب میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ کتاب وسنت میں سب مہینوں سے بڑھ کر اسی کے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ قرآنِ مجید میں اسلامی مہینوں میں سے صرف ماہِ رمضان ہی کا نام لے کر ذکر کیا گیا ہے۔ دنیا میں دیگر مہینوں کی بہ نسبت اسی کے فضائل و مسائل پر مشتمل بیسیوں کتب اب تک منصۂ شہود پر آچکی ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ان شاء اللہ!

① نزولِ قرآن: ماہِ رمضان المبارک کو ایک یہ بھی بے مثل فضیلت حاصل ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا آخری کلام قرآنِ مجید نازل ہوا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾

''ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو لوگوں کی ہدایت کرنے والا ہے اور جس میں ہدایت اور حق و باطل کی تمیز کی نشانیاں ہیں۔'' (البقرۃ:۱۸۵)

رمضان المبارک کی یہی فضیلت کافی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہوا جو سب سے اعلیٰ، خوبصورت اور جامع و مانع کلام ہے۔ دنیا کے تمام دانشور، ادیب اور فصیح مل کر بھی کلام الٰہی جیسی ایک بھی آیت نہیں بنا سکتے۔ یہ کلام لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔ شرک و بدعت کے اندھیروں میں روشنی کا چراغ ہے۔

② گناہوں کی بخشش: سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«من قام ليلة القدر إيمانا واحتسابا غفر له ماتقدم من ذنبه ومن صام رمضان إيمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه» (صحیح بخاری:۱۹۰۱)

''جو کوئی شبِ قدر میں ایمان کے ساتھ اور حصولِ ثواب کی نیت سے عبادت میں کھڑا ہو اس کے اگلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اور جس نے رمضان کے روزے ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے رکھے، اس کے بھی اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔''

* سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« من قام رمضان إيمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه» (صحیح مسلم:۷۵۹)

''جس نے رمضان میں ایمان کی وجہ سے اور ثواب کی نیت سے قیام کیا تو اس کے اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔''

* سیدنا کعب بن عجرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''(لوگو!) میرے منبر کے پاس حاضر ہو جاؤ، ہم لوگ حاضر ہوگئے۔ جب آپ ﷺ منبر کی پہلی سیڑھی پر چڑھے تو فرمایا: 'آمین'، دوسری پر چڑھے تو فرمایا: 'آمین'، جب تیسری پر چڑھے تو فرمایا: 'آمین' پھر جب آپ ﷺ منبر سے نیچے تشریف لائے تو ہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم نے آج آپ سے خلافِ معمول 'آمین' سنی ہے، پہلے کبھی اس طرح نہیں سنی

تھی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «إن جبريل عليه الصلاة والسلام عرض لي. فقال:بُعدًا لمن أدرك رمضان فلم يغفرله، قلت: آمين، فلما رقيت الثانية قال: بُعدًا لمن ذكرت عنده فلم يصل عليك قلت: آمين. فلما رقيت الثالثة قال: بعد لمن أدرك ابواه الكبر عنده أو أحدهما فلم يُدخلا الجنة قلت:آمين» (مستدرک حاکم:۱۵۴/۴، وقال صحیح الاسناد ووافقہ الذہبی)

''بے شک (جب میں پہلی سیڑھی پر چڑھا) تو حضرت جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام میرے پاس حاضر ہوکر بددعا کرنے لگے: وہ شخص رحمتِ الٰہیہ سے دور ہوجائے جو رمضان کا مہینہ پالے پھر اس کی بخشش نہ ہو۔ میں نے آمین کہا۔ جب میں دوسری سیڑھی پر چڑھا تو جبریل نے کہا: وہ شخص رحمتِ الٰہیہ سے دور ہو جس کے پاس آپ ﷺ کا ذکر کیا جائے اور وہ آپ ﷺ پر درود نہ بھیجے، میں نے آمین کہا اور جب تیسری سیڑھی پر چڑھا تو جبریل نے پھر بددعا کی کہ وہ شخص رحمتِ الٰہیہ سے دور ہو جس کے سامنے اس کے ماں اور باپ دونوں کو یا ایک کو بڑھاپا پہنچا اور اُنہوں نے اسے جنت میں داخل نہ کرایا، تو میں نے آمین کہا۔''

✵ سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«الصلوات الخمس والجمعة إلى الجمعة ورمضان إلى رمضان، مكفرات ما بينهن إذا اجتنب الكبائر» (صحیح مسلم:۲۳۳)

''پانچوں نمازیں اور ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان دوسرے رمضان تک درمیانی مدت کے گناہوں کو مٹا دینے والے ہیں جب کہ کبیرہ گناہوں سے بچا جائے۔''

معلوم ہوا کہ ماہِ رمضان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت، بخشش اور مغفرت کی موسلا دھار بارش ہوتی ہے جس میں ایمان داروں کو گناہوں کی گندگی اور پلیدی سے پاک صاف ہونے کا ایک سنہری موقع فراہم کیا جاتا ہے تو جو شخص اس سے فائدہ نہ اُٹھائے بلکہ اپنے نفس کو گناہوں کی نجاستوں میں غرق رکھے وہ انتہائی بدبخت اور بدقسمت ہے کہ اس میں وہ نیک اعمال کرکے اپنی بخشش نہ کرواسکا۔ گویا اس نے اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے میں ڈال دیا ہے۔

③ جہنم سے آزادی: سیدنا جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إن لله عزوجل عند كل فطر عتقاء وذلك في كل ليلة» (سنن ابن ماجہ:۱۶۴۳)

''اللہ تعالیٰ ہر افطار کے وقت لوگوں کو (جہنم سے) آزاد فرماتا ہے اور یہ (رمضان کی) ہر رات

میں ہوتا ہے۔''

* سیدنا ابوامامہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

«لله عزوجل عند كل فطر عتقآء» (مسند احمد:۵/۲۵۶)

''اللہ تعالیٰ ہر افطار کے وقت لوگوں کو (جہنم سے) آزاد فرماتا ہے۔''

* سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إذا كانت أوّل ليلة من رمضان صفدت الشياطين ومردة الجن وغلقت أبواب النار، فلم يفتح منها باب وفتحت أبواب الجنة، فلم يغلق منها باب، ونادٰى مناد: يا باغي الخير أقبل ويا باغي الشر أقصر ولله عتقاء من النار وذلك في كل ليلة» (سنن ابن ماجہ:۱۶۴۲)

''جب رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیطانوں اور سرکش جنوں کو جکڑ دیا جاتا ہے۔ جہنم کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں، ان میں سے کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا اور جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں رہتا اور ایک اعلان کرنے والا اعلان کرتا ہے: اے نیکی کے طلبگار! آگے بڑھ (اور نیکی کر) اے برائی کے طلبگار! (گناہ سے) رُک جا۔ اور اللہ تعالیٰ جہنم سے لوگوں کو آزاد کرتا ہے۔ (رمضان میں) ہر رات اسی طرح ہوتا ہے۔''

سبحان اللہ ماہِ رمضان کی شان اور اس کی عظمت کہ ہر شب بے شمار گناہ گاروں کو دوزخ کی آگ سے آزادی ملتی ہے۔ یہ شرف اور اِعزاز بھی صرف اسی مہینے کو حاصل ہے کہ جس کی ہر رات گناہ گاروں کے لیے خوشی کا پیغام لے کر شروع ہوتی ہے۔ اللہ ہمیں بھی ان لوگوں میں شامل فرمائے جنہیں جہنم سے آزاد کردیا گیا ہے۔ تاہم اس کے لیے آئندہ اپنی اصلاح اور گناہوں سے توبہ کرنا ضروری ہے۔

④ دعاؤں کی قبولیت: سیدنا ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إن لله تبارك وتعالىٰ عتقاء في كل يوم وليلة يعني في رمضان وإن لكل مسلم في كل يوم وليلة دعوة مستجابة» (الترغیب والترہیب، کتاب الصوم:۱۴۷۳)

''بے شک اللہ تعالیٰ ماہِ رمضان کے ہر دن اور رات میں لوگوں کو جہنم سے آزاد فرماتا ہے اور رمضان کے ہر روز وشب میں ہر مسلمان کے لیے ایک دعا ہے جسے قبولیت سے نوازا جاتا ہے۔''

* سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«ثلاثة لا تردّ دعوتهم: الصائم حتى يفطر، والإمام العادل، ودعوة المظلوم يرفعها الله فوق الغمام ويفتح لها أبواب السماء ويقول الرب: وعزتي لأنصرنك ولو بعد حين» (جامع ترمذی:۳۵۹۸ وقال:حسن)

''تین بندے ایسے ہیں جن کی دعا ردّ نہیں کی جاتی: روزہ دار حتیٰ کہ وہ روزہ افطار کرلے، عادل حکمران اور مظلوم کی دعا تو اللہ تعالیٰ بادلوں کے اوپر اُٹھاتا ہے اور اس کے لیے آسمان کے دروازے بھی کھول دیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میری عزت کی قسم! میں ضرور تیری مدد کروں گا خواہ کچھ دیر بعد ہی ہو۔''

٭ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«ان للصائم عند فطره لدعوة ما تردّ» (سنن ابن ماجہ، رقم ۱۷۵۳)

''روزے دار کے لیے افطاری کے وقت ایک ایسی دعا ہوتی ہے جو ردّ نہیں ہوتی۔''

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ رمضان المبارک کا پورا مہینہ دعاؤں اور التجاؤں کی قبولیت کا ہے۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے خزانے ہر وقت اور ہر آن کھلے ہوئے ہیں۔ انسان میں بندگی کا احساس اور مانگنے کا سلیقہ ہو تو مالکِ بے نیاز ہر وقت اپنے بندوں کی دعائیں سنتا اور ان کی مرادیں برلاتا ہے:

جو مانگنے کا سلیقہ ہے، اس طرح مانگو
خدا کے در سے بندے کو کیا نہیں ملتا؟

لیکن شب و روز کے اس نظام میں بعض ایام و شہور ایسے بھی آتے ہیں جن میں رحمتِ الٰہی کا دریا جوش میں ٹھاٹھیں مارنے لگ جاتا ہے۔ اس میں اگر دل کی لگن کے ساتھ دعا کی جائے تو وہ قبول ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَإِنِّىْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ﴾ (البقرۃ:۲/۱۸۶)

''اور جب تجھ سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو میں بہت ہی قریب ہوں۔ ہر وقت پکارنے والے کی پکار کو جب کبھی وہ مجھے پکارے، قبول کرتا ہوں۔ اس لیے لوگوں کو بھی چاہیے کہ وہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں یہی ان کی بھلائی کا باعث ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس آیت سے پہلے اور بعد میں رمضان المبارک کے احکام و مسائل بیان کئے، جبکہ درمیان میں یہ دعا کا مسئلہ بیان کر کے ایک تو اس کی فضیلت واضح کر دی اور دوسرا اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ ماہ رمضان دعاؤں کی قبولیت کا مہینہ ہے۔ واللہ اعلم

⑤ رحمت اور جنت کے دروازوں کا کھلنا، جہنم کے دروازوں کا بند ہونا اور شیاطین کا پابند سلاسل ہونا: سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إذا دخل رمضان فُتِحَتْ أبواب الجنة وغُلِّقَتْ أبواب جهنم وسُلْسِلَتِ الشياطين» (صحیح بخاری: ۳۲۷۷)

''جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے (بڑے اہتمام سے) کھول دیئے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے مکمل طور پر بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین کو پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے۔''

✵ سیدنا ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إذا كان رمضان فتحت أبواب الرحمة وغلقت أبواب جهنم وسلسلت الشياطين» (صحیح مسلم: ۱۰۷۹)

''جب رمضان آتا ہے تو رحمت کے دروازے خوب کھول دیئے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے اچھی طرح بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے۔''

✵ عرفجہؒ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ کے ایک صحابی نے بیان کیا کہ آپؐ نے فرمایا:

«في رمضان تفتح فيه أبواب السمآء وتغلق فيه أبواب النار، ويُصَفَّدُ فيه كل شيطان مريد و ينادي مناد كل ليلة: ياطالب الخير هلم! ويا طالب الشر أمسك» (النسائی رقم ۲۱۰۸)

''رمضان میں آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور ہر سرکش شیطان پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے۔ اعلان کرنے والا اعلان کرتا ہے: اے نیکی کے طالب! نیکی کر اور اے بُرائی کے طالب! بُرائی سے رُک جا۔''

ماہ رمضان میں کرنے والے اعمال

① روزہ

ماہِ رمضان کی ان برکات اور رحمتوں کو حاصل کرنے کے لیے اہل ایمان کو اس مہینے میں

جن خصوصی اعمال کا حکم دیا گیا ہے، ان میں روزہ سرفہرست ہے۔

جس طرح رمضان المبارک کے فضائل بے شمار ہیں، ایسے ہی روزے کے فضائل بھی بہت ہیں جن کی تفصیل سے یہ چند سطور قاصر ہیں۔ تاہم ذیل میں چند باتیں پیش خدمت ہیں:

* ماہِ رمضان کے روزے اللہ تعالیٰ نے اُمت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پر فرض کئے ہیں، جیسا کہ فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (البقرۃ:۱۸۳)

''اے ایمان والو! تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔''

* اسی طرح ارشاد فرمایا:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اُتارا گیا جو لوگوں کو ہدایت کرنے والا ہے اور جس میں ہدایت کی اور حق و باطل کی تمیز کی نشانیاں ہیں۔ تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے اسے روزہ رکھنا چاہئے۔ ہاں جو بیمار ہو، یا مسافر ہو تو اسے دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارادہ تمہارے ساتھ آسانی کا ہے، سختی کا نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ تم گنتی پوری کرلو اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائی بیان کرو اور اس کا شکر کرو۔''

ان آیاتِ بینات سے یہ بات واضح ہوئی کہ ماہِ رمضان کے روزے تمام اہل ایمان پر فرض کئے گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے روزے فرض کردیئے ہیں جیسا کہ گذشتہ سطور میں سنن نسائی کے حوالے سے حدیث گزر چکی ہے۔

* اسی طرح سنن نسائی وغیرہ کی وہ حدیث جس میں ہے کہ ایک اعرابی نے جب آپؐ سے فرائض اسلام کے متعلق پوچھا تو آپ نے رمضان کے روزوں کا بھی ذکر فرمایا: (سنن نسائی: ۲۰۹۰

صحیح) نیز حدیث ضمام بن ثعلبہ (سنن نسائی: ۲۰۹۱، ۲۰۹۲ صحیح) کے علاوہ بھی متعدد احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ماہ رمضان کے روزے فرض ہیں اور پھر اجماعِ اُمت اس پر مستزاد ہے۔

* ماہِ رمضان کے روزے اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ہیں جیسا کہ سیدنا ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«بُني الإسلام على خمس: شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمد رسول الله وإقام الصلاة وايتاء الزكاة والحج وصوم رمضان» (صحیح بخاری:۸)

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بیشک محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکاۃ ادا کرنا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔''

* سیدنا عمرو بن مرہ جہنیؓ بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ قضاعہ کا ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اگر میں اس بات کی گواہی دوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں، پانچوں نمازیں پڑھوں، زکوٰۃ ادا کروں، رمضان کے روزے رکھوں اور اس کا قیام کروں تو میرا شمار کن لوگوں میں ہوگا؟ آپ نے فرمایا:

«من الصديقين والشهداء» (صحیح ابن حبان: رقم ۳۴۲۹ صحیح)

* رمضان المبارک کے روزے تمام روزوں سے افضل ہیں۔ سیدنا ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا: «أفضل الصيام بعد رمضان شهر الله المحرم» (صحیح مسلم: ۱۱۶۳) ''رمضان کے بعد سب مہینوں سے زیادہ فضیلت والے روزے اللہ کے مہینے محرم کے ہیں۔'' باقی سب سے افضل روزے تو ماہ رمضان ہی کے ہیں تاہم رمضان کے بعد سب مہینوں سے زیادہ فضیلت والے روزے محرم الحرام کے ہیں۔

ماہِ رمضان کے روزے اہل ایمان کی بخشش اور مغفرت کا ذریعہ ہیں جیسا کہ گذشتہ سطور میں حدیث گذر چکی ہے۔

② قیام

ماہ رمضان میں کئے جانے والے خصوصی اعمال میں سے ایک عمل قیام رمضان بھی ہے، مگر یہ فرض تو نہیں تاہم انتہائی اہمیت وفضیلت کے پیش نظر مسنون اور مستحب ہے۔ اس لیے اگر کوئی

شخص اس سے غفلت برتے تو وہ بہت بڑے اجر وثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔ اسی لیے نبی ﷺ اپنے اصحاب کو اس کی بڑی ترغیب دلایا کرتے تھے چنانچہ سیدنا ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ

«كان رسول الله ﷺ يرغب في قيام رمضان من غير أن يأمرهم فيه بعزيمة فيقول: من قام رمضان إيمانا واحتسابا غُفرله ماتقدم من ذنبه»

''رسول اللہ ﷺ قیام رمضان کی ترغیب دیا کرتے تھے، بغیر اس کے کہ آپ واجبی طور پر اُنہیں حکم دیں۔ آپؐ فرماتے جو کوئی ایمان کے ساتھ حصولِ ثواب کی نیت سے رمضان کا قیام کرے اس کے پچھلے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔'' (صحیح مسلم:۷۵۹)

قیام رمضان کے حوالے سے چند اہم باتیں

① قیام رمضان دراصل تہجد ہی کی نماز ہے جسے رمضان میں 'تراویح' کہا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں:

والتراويح جمع ترويحة وهي المرة الواحدة من الراحة كتسليمة من السلام . سميت الصلاة في الجماعة في ليالي رمضان التراويح لأنهم أوّل ماجمعوا عليها كانوا يستريحون بين كل تسليمتين (فتح الباری:۴/۳۱۷)

''تراویح ترویحة کی جمع ہے جو راحت سے مشتق ہے یعنی آرام جیسے تسلیمة سلام سے مشتق ہے۔ رمضان کی راتوں میں جماعت سے (نفل) نماز ادا کرنے کو تراویح کہا جاتا ہے اس لیے کہ شروع میں لوگ ہر دو سلام کے بعد کچھ دیر آرام کیا کرتے تھے۔''

یاد رہے کہ نمازِ تراویح کو قیام اللیل اور صلاۃ اللیل بھی کہا جاتا ہے جب کہ حقیقت میں یہ (قیامِ رمضان، تہجد، صلاۃ اللیل یا قیام اللیل وغیرہ) سب ایک ہی نماز کے مختلف نام ہیں۔ تاہم غیر رمضان کی بہ نسبت رمضان المبارک میں اسے ادا کرنے کی زیادہ تاکید اور فضیلت بیان کی گئی ہے۔

② قیامِ رمضان یا نمازِ تراویح کا وقت عشا کی نماز کے بعد سے لے کر فجر کی اذان تک رہتا ہے۔ اس دوران اسے کسی بھی وقت ادا کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سیدہ عائشہؓ سے مروی ہے:

كان رسول الله ﷺ يصلي فيما بين أن يفرغ من صلاة العشاء — وهي التي يدعوا الناس العتمة — إلى الفجر إحدى عشر ركعة يسلم بين كل

ركعتين ويوتر بواحدة (صحیح مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین، باب صلاۃ اللیل، رقم:۷۳۶)

''رسول اللہ ﷺ نمازِ عشاء جسے لوگ عَتَمَة بولتے ہیں اور نمازِ فجر کے درمیان گیارہ رکعات ادا فرماتے۔ ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرتے اور ایک رکعت وتر پڑھتے تھے۔''

وقت کی اسی وسعت اور گنجائش کی وجہ سے نمازِ تراویح کو عشاء کے فوراً بعد بھی پڑھ لیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ قیامِ رمضان کی فضیلت حاصل کرسکیں۔ تاہم پھر بھی رات کے آخری حصے میں ادا کرنا زیادہ اجر وثواب کا مستوجب ہے۔

٭ سیدنا عبداللہ بن سلامؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يٰأيها الناس: افشوا السلام وأطعموا الطعام وصلوا والناس نيام تدخلو الجنة بسلام» (جامع ترمذی:۲۴۸۵ وقالہ صحیح)

''اے لوگو! سلام عام کرو، کھانا کھلایا کرو، رات کو جب لوگ سو رہے ہوں تو تم نماز پڑھا کرو، سلامتی کے ساتھ جنت میں چلے جاؤ گے۔''

٭ اسی طرح سیدنا ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«رَحِم الله رجلا قام من الليل فصلى وأيقظ امرأته فصلت فإن أبت رَشَّ في وجهها الماء. رحم الله امراة قامت من الليل فصلت وايقظت زوجها فصلى فان أبٰى رشت في وجهه الماء» (سنن ابن ماجہ:۱۳۳۶ 'حسن')

''اللہ تعالیٰ اس مرد پر رحم فرمائے جس نے رات کو اُٹھ کر نماز پڑھی اور اپنی بیوی کو جگایا پھر اس نے بھی نماز پڑھی۔ اگر اس کی بیوی نے جاگنے سے انکار کیا تو اس (مرد) نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اللہ تعالیٰ اس عورت پر بھی رحم فرمائے جس نے رات کو اُٹھ کر نماز پڑھی اور اپنے خاوند کو جگایا تو اس نے بھی نماز پڑھی۔ اگر خاوند نے اُٹھنے سے انکار کردیا تو عورت نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔''

٭ اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ ''رات کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے انتہائی قریب ہوجاتے ہیں۔ اگر تم اس وقت اللہ کو یاد کرنے والوں میں شامل ہوسکو تو ہوجاؤ۔'' (جامع ترمذی، کتاب الدعوات، رقم:۳۵۷۹، وقالہ: حسن صحیح)

نیز احادیثِ مبارکہ سے پتا چلتا ہے کہ نبی ﷺ کا اکثر معمول رات کے آخری حصے میں ہی

نماز پڑھنے کا تھا۔ آپ ﷺ رات کے اوّل حصے میں سوتے تھے اور آخری حصے میں نماز پڑھتے تھے۔ (صحیح بخاری، رقم:۱۱۴۶)

* یہ آپ ﷺ کا اکثر معمول تھا۔ ورنہ آپ نے رات کے سبھی حصوں میں نماز ادا کرکے اُمت پر آسانی فرمائی ہے، جیسا کہ سیدنا انس بن مالکؓ فرماتے ہیں جب ہم رسول اللہ ﷺ کو رات تہجد پڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتے تو ہم آپ کو اس حالت میں دیکھ لیتے تھے اور اگر ہم آپ کو سویا ہوا دیکھنا چاہتے تو دیکھ لیتے تھے۔ (صحیح بخاری:۱۱۴۱)

* سیدنا عمر بن خطابؓ نے اپنے دورِ خلافت میں جب اس نماز کی جماعت کا باقاعدہ اہتمام فرمایا تو ایک دن لوگوں کو رات کے اوّل حصے میں باجماعت تراویح ادا کرتے ہوئے دیکھ کر فرمایا:

والتي ينامون عنها أفضل من التي يقومون يريد آخر الليل وكان الناس يقومون أوّله۔ (صحیح بخاری، کتاب صلاۃ التراویح، باب فضل من قام رمضان، رقم:۲۰۱۰)

''رات کا وہ حصہ جس میں یہ لوگ سوجاتے ہیں اس حصے سے بہتر اور افضل ہے جس میں یہ نماز پڑھتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کی مراد رات کے آخری حصے (کی فضیلت) سے تھی۔ کیونکہ لوگ یہ نماز رات کے شروع ہی میں پڑھ لیتے تھے۔''

بہرحال نمازِ تراویح کا عشاء کے فوراً بعد پڑھ لینا جائز جب کہ دیر سے یعنی رات کے آخری حصے میں پڑھنا زیادہ فضیلت کا حامل ہے۔

④ نمازِ تراویح باجماعت یا جماعت کے بغیر ادا کرنا دونوں طرح جائز اور درست ہے۔ تاہم باجماعت ادا کرنے میں زیادہ فضیلت ہے۔ سیدنا ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«صلاة الجماعة تفضل صلاة الفذ بسبع وعشرين درجة» (صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب فضل صلاۃ الجماعۃ، رقم:۶۴۵)

''باجماعت نماز اکیلے شخص کی نماز سے ستائیس درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔''

اس حدیث کے عموم میں نمازِ تراویح کی جماعت بھی شامل ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی نمازِ تراویح کی جماعت کروائی ہے۔

* چنانچہ سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک رات مسجد میں نمازِ تراویح

پڑھی لوگوں نے بھی آپ کی اقتداء میں پڑھی پھر دوسری رات جب آپؐ نے پڑھی تو مقتدی زیادہ ہوگئے پھر تیسری رات بھی ایسے ہوا چوتھی رات جب لوگ (زیادہ) جمع ہوگئے تو آپ گھر سے تشریف ہی نہ لائے۔ جب صبح ہوئی تو نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد آپؐ نے فرمایا:

«أمابعد: فإنه لم يخفَ عليَّ مكانكم ولكني خشيت أن تُفرض عليكم فتعجزوا عنها» (بخاری، کتاب صلاۃ التراویح، باب فضل من قام رمضان، رقم:۲۰۱۲)

''امابعد! مجھے تمہارے یہاں جمع ہونے کا علم تھا لیکن مجھے خوف اس بات کا ہوا کہ یہ نماز تم پر فرض نہ کردی جائے اور پھر تم اس کی ادائیگی سے عاجز ہوجاؤ۔''

✵ سنن ابوداؤد کی روایت میں ہے:

وذلك في رمضان یعنی رمضان کی بات ہے۔ (ابوداؤد رقم ۱۳۷۳)

✵ سیدنا ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے۔ آپ نے ہمارے ساتھ کوئی قیام نہ کیا حتیٰ کہ مہینے میں ایک ہفتہ باقی رہ گیا تو آپ نے ہمیں قیام کروایا حتیٰ کہ تہائی رات ہوگئی۔ جب (آخر سے) چھٹی رات آئی تو آپ نے قیام نہ کرایا۔ جب پانچویں رات آئی تو ہمیں قیام کروایا حتیٰ کہ آدھی رات گزر گئی۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کاش ہمیں آپ بقیہ رات بھی اس کا قیام کروا دیتے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«إن الرجل إذا صلى مع الإمام حتىٰ ينصرف حسب له قيام الليل»

''انسان جب امام کے ساتھ (باجماعت) نماز پڑھتا ہے اور اس کے فارغ ہونے تک اس کے ساتھ رہتا ہے تو اس کے لیے پوری رات کا قیام شمار کیا جاتا ہے۔''

جب چوتھی رات آئی تو آپ نے قیام نہ کروایا۔ جب تیسری رات آئی تو آپ نے اپنے اہل خانہ، خواتین اور دوسرے لوگوں کو جمع فرمایا اور ہمیں (اتنا لمبا) قیام کرایا کہ ہمیں فکر لاحق ہوئی کہ کہیں ہماری سحری نہ رہ جائے۔ (سنن ابوداؤد: ۱۳۷۵ صحیح)

ان احادیث سے بصراحت واضح ہوگیا کہ نمازِ تراویح باجماعت ادا کرنا نہ صرف جائز بلکہ افضل ہے۔ نبی ﷺ نے تین راتوں میں مسجد آکر اجتماعی طور پر صحابہ کرامؓ کے ساتھ قیام کرکے ثابت فرمادیا کہ یہ مستحب ومسنون ہے۔ بعدازاں اس ڈر سے کہ کہیں یہ نماز باجماعت

ادا کرنے کی وجہ سے فرض نہ ہوجائے اور پھر اُمت اس کی ادائیگی سے عاجز ہوکر گناہ گار نہ ہوجائے، لہٰذا اسے جماعت سے پڑھانا ترک کردیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک، سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت اور سیدنا عمرؓ کے ابتدائی دور میں معاملہ اسی طرح رہا کہ کچھ لوگ باجماعت اور کچھ لوگ انفرادی طور پر اسے ادا کرتے تھے۔ تاآنکہ سیدنا عمرؓ نے تمام لوگوں کو ایک ہی امام کی اقتدا میں مستقل طور پر جمع فرمادیا۔

* چنانچہ عبدالرحمٰن بن عبدالقاری بیان کرتے ہیں کہ میں سیدنا عمرؓ کے ساتھ رمضان کی ایک رات کو مسجد میں گیا۔ سب لوگ متفرق اور منتشر تھے۔ کوئی اکیلا نماز پڑھ رہا تھا اور کچھ لوگ کسی کے پیچھے کھڑے ہوئے (باجماعت پڑھ رہے) تھے۔ اس پر سیدنا عمرؓ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ اگر تمام لوگوں کو ایک ہی قاری کے پیچھے جمع کردوں تو زیادہ اچھا ہوگا۔ چنانچہ اُنہوں نے یہی ٹھان کر سیدنا اُبی بن کعبؓ کو ان سب کا امام بنادیا۔ پھر ایک رات آپ نکلے دیکھا کہ لوگ اپنے امام کے پیچھے نمازِ تراویح (باجماعت) پڑھ رہے ہیں تو سیدنا عمرؓ نے فرمایا: یہ نیا طریقہ بہتر اور مناسب ہے۔ (صحیح بخاری، رقم:۲۰۱۰)

یہاں سے یہ بھی ثابت ہوا کہ سیدنا عمرؓ کے لوگوں کو ایک امام کی اقتدا میں جمع کرنے سے پہلے بھی بعض لوگ نمازِ تراویح باجماعت ادا کیا کرتے تھے اور پھر یہ کہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد چونکہ فرضیت والا خطرہ باقی نہ رہا تھا۔ اس لیے صحابہ کرام نے پھر مستقل طور پر ایک ہی امام کے پیچھے اسے باجماعت ادا کرنے کا اہتمام کردیا۔ آج اگر کوئی سر پھرا اس عمل کو ناجائز اور بدعت گردانے تو وہ بے علم، بے عمل اور مخالفِ صحابہ کرامؓ ہوگا کیونکہ اہل علم جانتے ہیں کہ اُمت میں آج تک کسی نے اسے بدعت نہیں کہا۔

④ جہاں تک رکعاتِ تراویح کی تعداد کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں نبی ﷺ کا عام معمول وتر سمیت گیارہ رکعات ہی کا تھا۔ تاہم بسااوقات آپ تیرہ رکعات بھی ادا فرمالیا کرتے تھے۔ چنانچہ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن راوی ہیں کہ اُنہوں نے سیدہ عائشہؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کی رمضان میں (رات کی) نماز کیسی ہوتی تھی؟ سیدہ عائشہؓ نے جواب دیا:

ما كان يزيد في رمضان ولا في غيره على إحدى عشرة ركعة

(صحیح بخاری، کتاب التراویح، باب فضل من قام رمضان، رقم:۲۰۱۳)

"رمضان ہوتا یا غیر رمضان آپ ﷺ گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔"

* سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے ہی مروی ہے:

إن رسول الله ﷺ كان يصلى بالليل إحدى عشرة ركعة ويوتر منها بواحدة...... الخ (صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب صلاۃ اللیل، رقم:۷۳۶)

"بلاشبہ رسول اللہ ﷺ رات کو گیارہ رکعات ادا فرماتے جن میں سے ایک وتر ہوتا تھا۔"

* سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں:

كان رسول الله ﷺ يصلي من الليل ثلاث عشرة ركعة يوتر من ذلك بخمس (ایضا، رقم:۷۳۷)

"رسول اللہ ﷺ رات کو تیرہ رکعات ادا فرماتے جن میں پانچ وتر ہوتے تھے۔"

* سیدنا جابرؓ بیان کرتے ہیں:

صلّى بنا رسول الله مسلم في رمضان ثمان ركعات والوتر

(صحیح ابن خزیمہ: ۱۳۸/۲، رقم: ۱۰۷۰ وسندہ حسن)

"رسول اللہ ﷺ نے ہمیں رمضان میں نماز پڑھائی، آپؐ نے آٹھ رکعات اور وتر پڑھے۔"

* اسی طرح سیدنا عمر بن خطابؓ نے سیدنا اُبی بن کعب اور تمیم داری کو حکم دیا کہ لوگوں کو نمازِ تراویح گیارہ رکعات پڑھائیں۔ (موطا امام مالک، کتاب صلاۃ اللیل، رقم:۲۴۹ سندہ صحیح)

* سیدنا اُبی بن کعب اور تمیم داری رمضان میں لوگوں کو گیارہ رکعات پڑھاتے تھے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۳۹۲/۱ دوسرا نسخہ: ۲۲۰/۵ سندہ صحیح)

* معلوم ہوا کہ قیامِ رمضان یعنی تراویح کی مسنون تعداد وتر سمیت گیارہ ہے۔ اسی پر خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرامؓ کا عمل تھا۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں:

الذى آخذ لنفسي في قيام رمضان هوالذى جمع به عمر بن الخطاب الناس إحدى عشرة ركعة وهي صلاة رسول الله ﷺ ولا أدري من أحدث هذا الركوع الكثير (کتاب التہجد، ص:۱۷۶ دوسرا نسخہ، ص:۲۸۷)

"میں تو اپنے لیے گیارہ رکعات تراویح کا قائل ہوں۔ اسی پر سیدنا عمر بن خطابؓ نے لوگوں کو

جمع کیا تھا اور یہی رسول اللہ ﷺ کی نماز تھی۔ میں نہیں جانتا کہ لوگوں نے یہ بہت سی رکعتیں کہاں سے نکال لی ہیں۔''

* علامہ ابوبکر بن العربی فرماتے ہیں:

والصحیح أن یُصَلّی إحدی عشرة رکعة صلاة النبي ﷺ وقیامه فأما غیر ذلك من الأعداد فلا أصل له (عارضۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی:۱۹/۴)

''صحیح بات تو یہی ہے کہ (نمازِ تراویح) گیارہ رکعات ہی پڑھنی چاہئے۔ یہی نبی ﷺ کی نماز اور قیام ہے۔ اس کے علاوہ جو اعداد ہیں تو ان کی کوئی اصل (کتاب وسنت میں) نہیں۔''

⑤ آخری بات یہ ہے کہ کیا تراویح اور تہجد دو الگ نمازیں ہیں یا ایک ہی نماز کے دو مختلف نام ہیں؟

اس سوال کا جواب آسان ہے کہ تہجد اور تراویح ایک ہی نماز کے دو مختلف نام ہیں۔ عام دنوں میں جسے نمازِ تہجد کہا جاتا ہے، وہی رمضان میں نمازِ تراویح کہلاتی ہے۔

حافظ عبداللہ محدث روپڑیؒ 'فتاویٰ اہل حدیث' میں فرماتے ہیں:

''تہجد اور تراویح ایک ہی ہے۔ مغایرت اسی اس طرح کی ہے جیسے دریائے برہم پتر، سانپر، مینگھنا۔ یہ تینوں ایک دریا کے نام ہیں جو جھیل مانسرور کوہِ ہمالیہ کی جانب شمال سے نکلتا ہے۔ اسی طرح اٹک، سندھ وغیرہ دریا ایک ہی ہے جس علاقے سے گزرا اس کے نام سے موسوم ہوگیا، ٹھیک اسی طرح تراویح ہے۔ رمضان میں اسی تہجد کا نام تراویح رکھ دیا گیا۔ کیونکہ چار پڑھ کر ذرا ترویحہ کرتے یعنی ٹھہر جاتے ہیں پھر یہ نام بھی رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے زمانہ میں نہ تھا بلکہ اس کو اس وقت قیامِ رمضان کے نام سے موسوم کرتے تھے جو بالکل دریا کی مثالِ مذکور کے موافق ہے جہاں سے گزرا، وہاں کے نام سے موسوم ہوگیا۔'' (۶۳۹/۱)

مزید وضاحت کیلئے: 'آپ کے مسائل اور اُن کا حل' از مولانا مبشر ربانی: ۳۰۲/۱ تا ۳۰۴

③ تلاوتِ قرآنِ کریم

ماہِ رمضان میں جن اعمال کا خصوصی اہتمام کرنا چاہئے، ان میں تلاوتِ قرآنِ مجید بھی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں رمضان کے روزوں کی فرضیت ذکر کی وہاں اس کے ساتھ ہی ماہِ رمضان کی یہ خصوصیت بھی بیان فرمائی:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کے لیے باعثِ ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی اور حق وباطل میں تمیز کی واضح دلیلیں ہیں۔''

معلوم ہوا کہ قرآن اور رمضان کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس لیے اس مہینے میں قرآنِ مجید کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کرنی چاہئے۔ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں:

وكان جبريل عليه السلام يلقاه كل ليلة في رمضان حتى ينسلخ، يعرض عليه النبي ﷺ القرآن (صحیح بخاری، کتاب الصوم، رقم:۱۹۰۲)

''جبریلؑ آپ ﷺ سے رمضان کی ہر رات کو ملتے تو نبی ﷺ اُنہیں قرآنِ مجید سناتے۔''

ایک روایت میں ہے:

وكان يلقاه في ليلة من رمضان فيدارسه القرآن (صحیح بخاری، بدء الوحی، رقم:۶)

''جبریل امینؑ رمضان المبارک میں ہر رات رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کرتے تو آپ ﷺ کے ساتھ قرآنِ مجید کا دور کیا کرتے تھے۔''

مولانا داؤد راز دہلویؒ فرماتے ہیں:

''یہ نزولِ قرآن لوحِ محفوظ سے بیت العزت میں سماء دنیا کی طرف تھا۔ پھر وہاں سے آنحضرت ﷺ پر نزول بھی رمضان شریف ہی میں شروع ہوا۔ اس لیے رمضان شریف قرآنِ کریم کے لیے سالانہ یادگار مہینہ قرار پایا اور اسی لیے اس ماہِ مبارک میں آپ ﷺ اور جبریل علیہ السلام قرآنِ مجید کا باقاعدہ دور فرمایا کرتے تھے۔'' (صحیح بخاری مترجم:۱۶۱/۳)

④ اِعتکاف

ماہِ رمضان کے خصوصی اعمال میں سے ایک اعتکاف بھی ہے۔ تمام دنیاوی مصروفیات ترک کرکے محض عبادت کی نیت سے مسجد میں آکر ٹھہرنے کو 'اعتکاف' کہتے ہیں۔ یہ مبارک عمل نبی کریم ﷺ کی سنتِ مؤکدہ سے ثابت ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ اپنی مدنی زندگی میں ہر سال ماہ رمضان کا جب آخری عشرہ شروع ہوتا تو مسجد میں آکر اعتکاف فرماتے۔ ایک سال کسی سفر کی وجہ سے یہ عمل چھوٹ گیا تو اگلے سال آپ نے بیس دن کا اعتکاف کیا۔ چنانچہ

سیدنا اُبی بن کعبؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف کیا کرتے تھے۔ ایک سال آپ (آخری عشرے کے دوران) سفر میں تھے، جب اگلا سال آیا تو آپ نے بیس دن کا اعتکاف کیا۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب الصیام، رقم:۱۷۷۰؛ سنن ابوداؤد، رقم:۲۴۶۳ 'صحیح')

✵ اسی طرح سیدہ عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ میں آپؐ کے لیے (مسجد میں) ایک خیمہ لگا دیتی اور آپ صبح کی نماز پڑھ کر اس میں چلے جاتے۔ پھر سیدہ حفصہؓ نے بھی سیدہ عائشہؓ سے خیمہ کھڑا کرنے کی اجازت چاہی تو اُنہوں نے دے دی اور اُنہوں نے ایک خیمہ کھڑا کرلیا۔ جب سیدہ زینبؓ بنت جحش نے دیکھا تو اُنہوں نے بھی اپنے لیے ایک خیمہ کھڑا کرلیا۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے کئی خیمے دیکھے تو فرمایا: «ما هذا؟» ''یہ کیا ہے؟'' آپ کو ان کی حقیقت کی خبر دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «البر ترون بِهنَّ» ''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ خیمے ثواب کی نیت سے کھڑے کئے گئے ہیں؟'' پھر آپ نے اس مہینے (رمضان) کا اعتکاف چھوڑ دیا اور شوال کے عشرے کا اعتکاف کیا۔ (صحیح بخاری، کتاب الاعتکاف، باب اعتکاف النساء، رقم:۲۰۳۳)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رمضان کے اعتکاف کی قضا کسی دوسرے مہینے میں بھی دی جاسکتی ہے۔

✵ سیدنا ابن عمرؓ فرماتے ہیں:

كان رسول الله ﷺ يعتكف العشر الأواخر من رمضان (صحیح بخاری:۲۰۲۵)

''یعنی رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔''

✵ سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے:

أن النبي ﷺ كان يعتكف العشر الأواخر من رمضان حتى توفاه ثم اعتكف أزواجه من بعده (صحیح بخاری:۲۰۲۶، صحیح مسلم:۱۱۷۲)

''نبی ﷺ اپنی وفات تک مسلسل رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کرتے رہے اور پھر آپ کے بعد آپ کی اَزواج اعتکاف کرتی رہیں۔''

⑤ دیگر افعالِ خیر

ماہِ رمضان میں ان مذکورہ بالا اعمال کے علاوہ نیکی وخیر کے دیگر جتنے بھی کام ہیں، ان

سب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے، مثلاً صدقہ وخیرات، دعوت وتبلیغ، دعا ومناجات، ذکر و اذکار، توبہ و استغفار، تعلیم وتعلّم، صلہ رحمی وغیرہ یعنی خیر کے ان تمام کاموں کی طرف سبقت حاصل کرنی چاہیے۔ رسولِ کریم ﷺ کے متعلق سیدنا ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ

''آپ ﷺ خیر کے کاموں میں سب سے زیادہ سخی تھے۔ یہ سخاوت ماہِ رمضان میں اس وقت اور بڑھ جاتی جب جبریل امینؑ آپ سے ملاقات کرتے۔ اس وقت آپ تیز ہوا سے بھی زیادہ جلدی کرتے ہوئے خیر کے کاموں کی طرف سبقت لے جاتے تھے۔'' (بخاری: رقم ٦)

مولانا داؤد رازؒ دہلوی فرماتے ہیں:

''جود کے معنی إعطاء ما ینبغي لمن ینبغي کے ہیں جو بہت زیادہ عموم لیے ہوئے ہے۔ پس جود (سخاوت) مال ہی پر موقوف نہیں بلکہ جو شے بھی جس کے لیے مناسب ہو، اسے دے دی جائے۔ اس لیے آپ 'اَجود الناس' تھے۔ حاجت مندوں کے لیے مالی سخاوت، تشنگانِ علوم کے لیے علمی سخاوت، گمراہوں کے لیے فیوضِ روحانی کی سخاوت، الغرض آپ ہر لحاظ سے تمام بنی نوع انسان میں بہترین سخی تھے۔ آپ کی جملہ سخاوت کی تفصیلات کتبِ احادیث وسیر میں منقول ہیں۔ آپ ﷺ کی جود وسخاوت کی تشبیہ بارش لانے والی (تیز) ہواؤں سے دی گئی ہے جو بہت ہی مناسب ہے۔ بارانِ رحمت سے زمین سرسبز وشاداب ہوجاتی ہے۔ آپ کی جود وسخاوت سے بنی نوع انسان کی اُجڑی ہوئی دنیا آباد ہوگئی۔ ہر طرف ہدایات کے دریا بہنے لگے۔ خداشناسی اور اخلاقِ فاضلہ کے سمندر موجیں مارنے لگے۔ آپ ﷺ کی سخاوت اور روحانی کمالات سے ساری دنیائے انسانیت نے فیض حاصل کئے اور یہ مبارک سلسلہ تاقیامِ دنیا قائم رہے گا۔'' (صحیح بخاری مترجم: ٣/١٦١،١٦٢)

* گزشتہ سطور میں آپ حدیث ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ ماہِ رمضان کی ہر رات ایک اعلان کرنے والا اعلان کرتا ہے:

یا طالب الخیر هلمّ، و یا طالب الشر أمسك (سنن نسائی، رقم: ٢١٠٨)

''اے خیر کے طالب! (خیر کی طرف) جلد آ، اے بُرائی کے طالب! (بُرائی سے) رُک جا۔''

⑥ ماہِ رمضان کا آخری عشرہ

ویسے تو رمضان المبارک کا پورا مہینہ ہی اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں سے لبریز ہے۔ لیکن اس کے آخری دس دن تو بہت ہی زیادہ فضیلت کے حامل ہیں۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ

ان میں عبادت کے لیے کمر کس لیتے تھے۔ چنانچہ سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں:

كان النبي ﷺ إذا دخل العشر شدَّ مئزره وأحيا ليله وأيقظ أهله

''جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو نبی ﷺ اپنی کمر کس لیتے اور ان راتوں میں خود بھی جاگتے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگایا کرتے تھے۔'' (صحیح بخاری، کتاب لیلۃ القدر، رقم:۲۰۲۴)

کمر کس لینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس عشرے میں عبادتِ الٰہی کے لیے خاص محنت کرتے، خود جاگتے، گھر والوں کو جگاتے اور رات بھر عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے اور آنحضرت ﷺ کا یہ سارا عمل تعلیم اُمت کے لیے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

''اے ایمان والو! اللہ کے رسول ﷺ تمہارے لیے بہترین نمونہ ہیں۔''

''ان کی اقتدا کرنا ہمارے لئے سعادت مندی ہے۔ یوں تو ہمیشہ ہی عبادت الٰہی کرنا بڑا کارِ ثواب ہے لیکن رمضان کے آخری عشرہ میں عبادتِ الٰہی کرنا بہت ہی بڑا کارِ ثواب ہے۔ لہٰذا ان ایام میں جس قدر بھی عبادت ہو سکے، غنیمت ہے۔'' (بخاری مترجم داؤد راز:۳/۲۵۱)

سیدہ عائشہؓ ہی سے مروی ہے کہ

كان رسول الله ﷺ يجتهد في العشر الأواخر ما لا يجتهد في غيره

''رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرے میں (عبادت میں) اتنی محنت کرتے جتنی اور دنوں میں نہیں کرتے تھے۔'' (صحیح مسلم، کتاب الاعتکاف، رقم:۱۱۷۵)

⑦ شبِ قدر

ماہِ رمضان کو بالعموم اور اس کے آخری عشرے کو بالخصوص چار چاند لگانے والی اصل چیز لیلۃ القدر یعنی شبِ قدر ہے جسے قرآن میں لیلۃ مبارکۃ بھی کہا گیا ہے۔ اس رات کی فضیلت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ﴾ (الدخان:۱تا۵)

''حٰم، قسم ہے اس وضاحت والی کتاب کی۔ یقیناً ہم نے اسے بابرکت رات میں اُتارا ہے۔ بے شک ہم ڈرانے والے ہیں، اسی رات میں ہر ایک مضبوط کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے

پاس سے حکم ہوکر، ہم ہی رسول بنا کر بھیجنے والے ہیں۔''

ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ ۝ سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾ (القدر:۱تا۵)

''یقیناً ہم نے ہی اسے یعنی قرآن کو شب قدر میں نازل فرمایا، تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس میں ہر کام کے سرانجام دینے کو اپنے ربّ کے حکم سے فرشتے اور روح (جبریل) اُترتے ہیں۔ یہ رات سراسر سلامتی کی ہوتی ہے اور فجر کے طلوع ہونے تک رہتی ہے۔''

* سیدنا ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«من يقم ليلة القدر إيمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه» (صحیح بخاری:۳۵)

''جس نے شب قدر میں حالت ایمان اور ثواب کی نیت سے قیام کیا، اس کے گذشتہ گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔''

* لیلۃ القدر اپنی تمام تر عظمتوں اور فضیلتوں سمیت ہر سال ماہِ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں آتی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

« تَحرَّوا ليلة القدر في الوتر من العشر الأواخر من رمضان» (بخاری:۲۰۱۷)

''شب قدر کو ماہ رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔''

* عبادہ بن صامتؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں شب قدر کی خبر دینے کے لیے تشریف لا رہے تھے کہ دو مسلمان آپس میں کچھ جھگڑا کرنے لگے تو آپؐ نے فرمایا:

«خرجت لأخبر كم بليلة القدر فتلاحى فلان وفلان فرفعت وعسىٰ أن يكون خيرًا لكم فالتمسوها في التاسعه والسابعة والخامسة» (ایضاً، :۲۰۲۳)

''میں تمہیں شب قدر بتانے کے لیے نکلا تھا۔ لیکن فلاں اور فلاں نے آپس میں جھگڑا کرلیا تو اس (شب قدر) کا علم واپس اُٹھا لیا اور امید یہی ہے کہ تمہارے حق میں یہی بہتر ہوگا۔ لہٰذا اب تم اسے (رمضان کی) اکیسویں، تیسویں اور پچیسویں رات میں تلاش کرو۔''

* سیدنا ابوبکرہؓ کے پاس شب قدر کا ذکر ہوا تو اُنہوں نے کہا: میں اسے کسی ایک رات

میں تلاش نہیں کرتا۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ آخری عشرے میں ہے اور یہ بھی سنا:

«التمسوها في تسع يَبقين أو في سبع يبقين أوْ في خمس يبقين أو في ثلاث أو آخر ليلة» (جامع ترمذی، کتاب الصوم، رقم:۷۹۴ وقالہ: حسن صحیح)

''جب نو، سات، پانچ یا تین یا آخری رات باقی رہ جائے تو اسے تلاش کرو۔''

سیدنا ابوبکرہؓ رمضان کی پہلی بیس راتوں میں عام دنوں کی طرح (معمول کے مطابق) نماز پڑھتے لیکن جب آخری عشرہ شروع ہوتا تو عبادت میں خوب محنت کرتے۔

معلوم ہوا کہ ماہ رمضان کے آخری عشرہ کی پانچ طاق (۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۹) راتوں میں سے کوئی ایک رات قدر والی ہے۔ ان مختلف احادیث کی بنا پر کسی ایک رات کو متعین نہیں کیا جاسکتا۔ عین ممکن ہے کہ یہ ان پانچ طاق راتوں میں ہر سال بدل بدل کر آتی ہو۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس رات کی تعیین کے متعلق چھیالیس مختلف اقوال بیان کئے ہیں۔ پھر آخر میں اپنا فاضلانہ فیصلہ ان الفاظ میں دیتے ہیں: وأرجحها كلها أنها في وتر من العشر الأخر وأنها تنتقل كما يُفهم من أحاديث الباب (فتح الباری:۴/۳۳۸)

''ان سب اقوال میں میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ شب مبارک رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہوتی ہے اور یہ ہر سال منتقل ہوتی (بدلتی) رہتی ہے جیسا کہ اس موضوع کی احادیث سے عیاں ہے۔''

بہرحال ماہِ رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات قدر والی ہے جس کی تعیین نہیں کی جاسکتی، اس لیے ہمیں ان پانچ راتوں میں خوب عبادت کرنی چاہئے تاکہ اس کی فضیلت حاصل کی جاسکے۔

شبِ قدر کی علامات

① شبِ قدر میں جب چاند نکلتا ہے تو ایسے ہوتا ہے جیسے بڑے تھال کا کنارہ۔ (صحیح مسلم:۱۱۷۰)

② شبِ قدر ایک خوشگوار رات ہے جس میں نہ گرمی ہوتی ہے اور نہ سردی۔ اس صبح کا سورج اس طرح طلوع ہوتا ہے کہ اس کی سرخی مدھم ہوتی ہے۔ (ابن خزیمہ:۳/۳۳۱؛ ۲۱۹۱ 'حسن')

③ شبِ قدر کی صبح سورج یوں طلوع ہوتا ہے کہ اس کی شعاعیں نہیں ہوتیں۔ (مسلم:۷۶۲)

شبِ قدر کی دعا

رسول اللہ ﷺ نے شبِ قدر کی عظمت وفضیلت کے باعث اس رات کے لیے اپنی اُمت کو ایک نہایت ہی جامع و مانع دعا سکھلائی گو کہ اس رات بھی آدمی حسبِ معمول جو دعا چاہے مانگ سکتا ہے۔ تاہم اس رات کو جو خاص دعا ہے، اسے ضرور مانگنا چاہئے اور وہ دعا یہ ہے:

«اللهم إنك عفو كريم تحبّ العفو فاعف عني»

''اے اللہ بے شک آپ معاف کرنے والے کرم فرمانے والے ہیں، معافی کو پسند فرماتے ہیں لہٰذا مجھے معاف فرمادیں۔'' (جامع ترمذی:۳۵۱۳، وقالہ: حدیث حسن صحیح)

ایک انوکھی منطق؟

فرقہ بریلویہ سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر طاہر القادری اپنی کتاب 'میلاد النبی ﷺ' صفحہ ۳۶ پر لکھتے ہیں کہ شبِ میلاد لیلۃ القدر سے بھی افضل ہے۔

اسی طرح آگے چل کر صفحہ ۱۹۱ پر لکھتے ہیں:

''پس اگر کہا جائے کہ شبِ میلاد رسول اللہ ﷺ شبِ قدر سے بھی افضل ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ باری تعالیٰ نے لیلۃ القدر کو ہزار مہینوں سے افضل قرار دے کر اس کی فضیلت کی حد مقرر فرمادی جبکہ شبِ میلاد رسول اللہ ﷺ کی فضیلت حدِ ادراک سے ماوراء ہے۔''

قارئین کرام! غور کریں ایک طرف قرآن مجید جو لاریب کتاب ہے جبکہ دوسری طرف قادری صاحب کی یہ انوکھی منطق جو نص کے صریحاً خلاف ہے۔ حالانکہ ہمارے لیے دین وہی ہے جو منزل من اللہ ہے، ہمیں اپنی طرف سے اضافہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کو بھی یہ اختیار تفویض نہیں فرمایا کہ وہ اپنی مرضی سے دین میں اضافہ کرلیں تو یہ اضافہ کسی امتی کے لئے کتنی بڑی جسارت ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آج سے چودہ سو سال قبل اپنے آخری رسول ﷺ پر جو دین نازل کیا تھا، وہ آپ ﷺ نے من وعن اُمت تک پہنچا دیا ہے۔ آج یہ دین کتاب وسنت کی صورت میں ہی ہمارے پاس محفوظ ہے، لہٰذا یہ بات ہمیشہ ذہن میں ہونی چاہئے کہ جب تک کوئی نص قطعی موجود نہ ہو کسی دن یا رات یا کسی اور کو افضل یا غیر افضل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اگر واقعی شب ِمیلاد، شب ِقدر سے افضل ہے تو یہ بات اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو کیوں نہ بتائی؟ یا اگر رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم تھا تو آپ نے اس سے اُمت کو آگاہ کیوں نہ کیا؟

اگر اللہ نے یہ بات اپنے رسول ﷺ کو نہیں بتائی اور نہ ہی نبی ﷺ نے اپنی طرف سے اس کے متعلق کچھ فرمایا ہے تو قادری صاحب کو یہ اختیار کس نے دیا کہ وہ ایک ایسی بات کریں جو قرآن وحدیث کے خلاف ہو۔ کیا یہ قرآن وحدیث کی گستاخی نہیں؟

⑧ صدقہ فطر

صدقہ فطر کو زکوٰۃ فطر، زکوٰۃِ صوم، زکوٰۃ رمضان، صدقہ رمضان، فطرانہ اور صدقہ صوم بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد وہ صدقہ ہے جو ماہ رمضان کے اختتام پر روزوں کے مکمل ہونے کی خوشی اور ان میں ہوجانے والی کمی کوتاہی کے پیش نظر دیا جاتا ہے تاکہ یہ گناہوں کا کفارہ بن جائے اور محتاجوں کے لیے عید کی خوشیوں میں شمولیت کا ذریعہ بن جائے۔

راجح یہی ہے کہ صدقہ فطر جنس خوراک میں سے ایک صالح مرد، عورت، چھوٹے بڑے، آزاد غلام ہر مسلمان پر فرض ہے۔ چنانچہ سیدنا ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں:

أن رسول الله ﷺ فرض زكوٰة الفطر من رمضان على الناس صاعًا من تمر أو صاعا من شعير على كل حر أو عبد ذكر أو أنثى من المسلمين

''رسول اللہ ﷺ نے رمضان کا صدقہ فطر ایک صاع کھجور یا جو، آزاد، غلام، مرد، عورت ہر مسلمان پر فرض کیا ہے۔'' (صحیح مسلم، رقم:۹۸۴)

دوسری روایت میں یوں ہے:

فرض النبي ﷺ صدقة رمضان على الحر والعبد والذكر والأنثى صاعًا من تمر أوصاعا من شعير (ایضاً)

''رسول اللہ ﷺ نے رمضان کا صدقہ ہر آزاد، غلام، مرد اور عورت پر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو، کا فرض کیا ہے۔''

صدقہ فطر رمضان المبارک کے اختتام پر اور نماز عید کی ادائیگی سے پہلے پہلے ادا کردینا چاہئے۔

یہ ہیں رمضان المبارک کے خصوصی اعمال، اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو عمل کی توفیق دے۔ آمین!

تعلیم وتعلّم

ڈاکٹر محمود احمد غازی

اسلام کا تصورِ تعلیم

فرد کی تعلیم وتربیت کا مقصد

فرد کی تربیت کی جب بھی بات ہوئی ہے تو ایک سوال ہمیشہ یہ رہا ہے کہ فرد کی تربیت کا مقصود اصلی کیا ہے؟ مسلمان کی نظر میں تو مقصود اصلی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس لیے کہ جہاں یہ ایمان ہو کہ یہ زندگی عارضی ہے اور بالآخر ایک نئی زندگی آنی ہے جہاں کامیابی اور ناکامی کے نتائج سامنے آئیں گے وہاں منزل مقصود کا سوال متعین ہے اور واضح ہے۔ لیکن جن اقوام میں آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ان کے ہاں یہ سوال بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ فرد کی تربیت کا محرک کیا ہو؟

یونانیوں نے اس کے لیے جو اصطلاح استعمال کی اس کا انگریزی ترجمہ happiness یعنی 'خوشی' ہے۔ مجھے نہیں پتا، اس لیے کہ میں یونانی نہیں جانتا، کہ اصل یونانی لفظ کیا ہے اور اس کا حقیقی ترجمہ کیا ہے؟ لیکن حکیم ارسطاطالیس اور دوسرے یونانی مفکرین نے happiness یعنی 'خوشی' اور مسرت کو انسانی زندگی کا منزلِ مقصود قرار دیا۔ ان کے خیال میں ہر انسان خوشی اور مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن خود مسرت کیا ہے؟ اس پر جب یونانیوں نے غور کیا تو ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ جب انسان کو لذت حاصل ہوتی ہے تبھی اس کو مسرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ لذیذ کھانے کھاتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔ اچھا لباس پہنتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسری بہت سی لذتیں، جسمانی و مادی لذتیں، ایسی ہیں کہ جب وہ حاصل ہوتی ہیں تو انسان خوش ہوتا ہے۔ لہٰذا لذت اور مسرت دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزم قرار پا گئے۔

اگر لذت ہی کو انسان کا ہدف قرار دے دیا جائے تو اس سے جو اخلاقی قباحتیں اور تباہیاں

www.KitaboSunnat.com

پیدا ہوتی ہیں، ان کا اندازہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔شاید اسی لیے متکلمین اسلام اور صوفیا نے بالخصوص اور مسلم فلاسفہ نے بالعموم اس کے لیے 'سعادت' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ سعادت کا لفظ قرآنِ پاک میں متعدد بار استعمال ہوا ہے۔قرآنِ مجید نے کامیاب انسان کو سعید قرار دیا ہے۔ فمنهم شقي وسعيد انسان دو قسم کے ہیں۔ایک وہ ہے جن کو سعادت اور نیک بختی حاصل ہے۔ دوسرے وہ ہیں جن کو نیک بختی حاصل نہیں ہے۔ وہ بد بخت ہیں۔ سعادت کے لفظ میں وہ تمام خوبیاں شامل ہیں جو قرآنِ پاک اور سنتِ رسولؐ کا ہدف ہیں اور جو انسان کو اس دنیا میں اور آخرت میں کامیابی سے ہم کنار کرسکتی ہیں۔ سعادت حقیقی کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ وہ تدابیر اختیار کی جائیں جو انسان کو بہیمیت کے منفی نتائج سے محفوظ رکھیں، انسانیت کے ملکوتی پہلو کو ترقی دیں اور اس دنیا میں صلاح اور آخرت میں فلاح کے لیے انسانوں کو کامیاب اور مستحق بنائیں۔

یہ خلاصہ ہے اس مفہوم کا جو سعادت کے بارے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے امام غزالی، فارابی، ابن سینا اور بہت سے مفکرین اسلام نے بیان کیا ہے۔شاہ ولی اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ سعادت کے حصول کے ضمن میں انسانوں کے چار درجے ہوسکتے ہیں۔ اور مشاہدہ یہ ہے کہ ہر دور میں یہ چاروں طبقے سعادت کے حوالے سے موجود رہتے ہیں۔

① کچھ لوگ تو وہ ہیں کہ جن کو نہ سعادت حاصل ہے اور نہ اُمید ہے کہ ان کو کبھی سعادت حاصل ہوگی۔یعنی اُنہوں نے اپنی بہیمیت کو اتنا قوی اور ناقابل شکست بنا دیا ہے کہ اب ان میں ملکوتی عناصر یا ختم ہوگئے ہیں یا بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کے بارہ میں قرآن مجید میں کہا گیا ہے: ﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ (البقرۃ:۱۸) ''یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اس لیے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔''

② ایک طبقہ وہ ہے جو خاصی بڑی تعداد میں ہوتا ہے جس کو فی الوقت تو سعادت حاصل نہیں ہے، لیکن اُمید ہے کہ سعادت حاصل ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اس کے اندر کی بہیمیت ابھی پورے طور پر زور آور نہیں ہوئی، اور ملکوتیت بھی پورے طور پر ختم نہیں ہوئی۔

③ ایک تیسرا طبقہ ہے جو نسبتاً کم ہوتا ہے۔ یہ وہ ہے جو پیدائشی طور پر یا اپنی جبلت کے لحاظ

www.KitaboSunnat.com

سے، اپنے مزاج اور تربیت کے لحاظ سے ایسا ہے کہ اس نے ازخود اپنے اندر ملکوتی عناصر کو ترقی دے رکھی ہے اور اپنے اندر کی بہیمیت کو کنٹرول کیا ہوا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہر زمانے میں 'سابقین اولین' ہوئے۔ صحابہ کرام میں کثرت سے ایسے لوگوں کی مثالیں ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ «خیارکم في الجاهلية خیارکم في الإسلام» (صحیح بخاری:۳۳۷۴)

''جو جاہلیت میں اچھے اور سعید تھے وہ اسلام میں بھی اچھے اور سعید/نیک بخت ہیں۔''

④ ایک طبقہ وہ ہے کہ جس میں نہ صرف فی الوقت سعادت موجود ہے بلکہ مزید سعادت کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس طبقہ کو یہ صلاحیت اور ہمت دی ہے کہ وہ دوسروں کو بھی سعادت اور خیر کی طرف لاسکتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو قرآن نے 'والسابقون السابقون' کہا ہے کہ سابقین اولین کے بھی وہ سابقین اوّلین ہیں۔ وَالسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ اُولٰئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ! یہ وہ مقربان بارگاہ الٰہی ہیں جو ہر دور اور ہر زمانے میں انسانوں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنتے ہیں اور انسانیت کے لیے عزت وتکریم کا باعث ہوتے ہیں۔

جب انسان اس سعادت کے حصول کے لیے پیش قدمی کرتا ہے تو اس کو دو قسم کے کام کرنے ہوتے ہیں۔ کچھ کام تو وہ ہیں جو کہ ظاہری اعتبار سے اس لیے کرنے چاہئیں کہ انسان اپنے ظاہر کو سعادتِ حقیقیہ کے تقاضوں کے مطابق ڈھال سکے۔ یہ شاہ ولی اللہ کے الفاظ ہیں۔ ''انسان اپنے ظاہر کو سعادت کے تقاضوں کے مطابق ڈھال سکیں۔'' شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ شریعت نے جتنے احکام دیے ہیں، عبادتیں مقرر کی ہیں، معاملات کے بارہ میں ہدایات دی ہیں۔ یہ سب کا سب اسی لیے ہے کہ انسان کا ظاہر اس کی سعادتِ حقیقیہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور ہم کنار ہو جائے۔ کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جس کا تعلق اندر کی اصلاح سے ہوتا ہے۔ بظاہر وہ اصلاح نظر نہیں آتی، بظاہر انسان کے ظواہر پر اس کا اثر نہیں پڑتا، لیکن اندر ایک ایسا جذبہ خدا ترسی اور خوفِ الٰہی کا پیدا ہوجاتا ہے کہ انسان ایک خاص انداز میں خود بخود چلنے لگتا ہے۔ شریعت اس کے لیے فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ شریعت پر وہ عمل درآمد اس طرح کرنے لگتا ہے کہ جس طرح حدیث میں ہے کہ ''اللہ کی عبادت ایسے

www.KitaboSunnat.com

کرو کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ اس لیے کہ اگر تم اللہ کو نہیں دیکھ رہے تو یہ یقین رکھو کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' (صحیح بخاری:۵۰)

جب یہ سعادتِ حقیقیہ حاصل ہو جاتی ہے تو اس کے چار نتائج انسان کے طرزِ عمل میں سامنے آتے ہیں:

① پہلا نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اندر جو منفی رجحانات ہیں، جن کے لیے بہیمیت کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، یہ انسان کے مثبت رملکوتی رجحانات کے تابع ہو جاتے ہیں۔

② جب ایسا ہو جائے تو پھر انسان کی خواہشات اور اَہواء انسان کی عقل کے تابع ہو جاتی ہیں۔ عقل اہواء کے تابع نہیں ہوتی بلکہ اہواء اور خواہشات عقل کے تابع ہو جاتی ہیں۔

③ تیسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کا نفس ناطقہ، انسان کی حقیقت، اندر سے خود بخود اس عمل کے نتیجے میں شریعت کے احکام اور عقائد سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے لیے شریعت فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ دوسرے انسان جس پر بہ تکلف عمل کرتے ہیں، وہ ایک تربیت یافتہ فرد کے لیے فطرتِ ثانیہ کی بات ہو جاتی ہے اور اس سے خود بخود شریعت کے احکام پر عمل درآمد ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

④ اور آخری چیز یہ کہ اس کو حضوری کی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے، جس کو حدیث میں 'احسان' کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ اس کیفیت کو حاصل کرنے کے لیے دو طرح کی تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ کچھ تدابیر تو وہ ہیں جو علمی تدابیر کہلاتی ہیں اور کچھ تدابیر عملی تدابیر ہیں۔ علمی تدابیر میں دنیاوی علم بھی شامل ہے اور شریعت کا علم بھی۔ دنیاوی تدابیر میں تربیت بھی شامل ہے اور انسان کی ظاہری تہذیبِ نفس بھی شامل ہے۔ یہ سب علمی تدابیر ہیں۔ عملی تدابیر سے مراد انسان کو ایک ایسے معاشرے کا فراہم ہونا اور ایک ایسے ماحول کا دستیاب ہونا ہے جہاں اس کے لیے ان چیزوں پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔

علم کی اہمیت وحیثیت

اب چونکہ علم کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بغیر تربیت مکمل نہیں ہوسکتی۔ تربیت کے

www.KitaboSunnat.com

بغیر فرد معیاری فرد نہیں بن سکتا۔ معیاری فرد کے بغیر معیاری خاندان وجود میں نہیں آ سکتا۔ معیاری خاندان کے بغیر معیاری امت وجود میں نہیں آ سکتی۔ امت کے بغیر انسانیت کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ امت کے بغیر ریاست قائم نہیں ہوسکتی۔ ریاست کی مدد اور وسائل کے بغیر شریعت کے بہت سے احکام پر عمل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اصل الاصول بنیادی طور پر علم ٹھہرتا ہے۔ اب علم بھی ایک وحدت ہے۔ دینی علم ہو یا دنیاوی علم، دونوں ایک ہی حقیقت کبریٰ کے مختلف مظاہر ہیں۔ حقیقت ایک ہے اور حقیت کبریٰ ایک۔ اس لیے جس علم کا تعلق اس حقیقت سے جتنا قریبی ہے وہ علم اتنا ناگزیر ہے۔ جتنا دُور ہے اتنا ہی ناگزیر نہیں ہے۔

فرضِ عین 'علم'

ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ علم کی حیثیت فرض عین کی ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ علم کی حیثیت فرضِ کفایہ کی ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک درجہ ہوتا ہے کہ علم کی کیفیت محض ایک ایسے نکتے کی ہوتی ہے جس کو برصغیر کے بعض اہل علم نے دسترخوان کی چٹنی سے تشبیہ دی ہے۔ دسترخوان میں چٹنیاں بھی ہوتی ہیں، لیکن وہ مرکزی کھانے کا حصہ تو نہیں ہوتیں اور ہو بھی نہیں سکتیں، لیکن چٹنی کے بغیر دسترخوان کی تکمیل بھی نہیں ہوسکتی۔

اسی طرح سے علم کا ایک درجہ ہے جس کو امام شاطبیؒ نے ملح العلم کے نام سے یاد کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک علم کا صلب یعنی core ہے، اور ایک وہ ہے کہ جو علم کا اصل تو نہیں ہے لیکن اس کی حدود پر ہے اور ایک وہ ہے جو ملح العلم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کا علم سے تعلق نہیں ہے اور وہ علم' غیر نافع ہے۔ یہ استدلال اُنہوں نے اس حدیث سے کیا جس میں حضورعلیہ السلام نے فرمایا کہ «اللّٰهم إني أعوذ بك من علم لا ينفع» (صحیح مسلم:۲۷۲۲) ''اے اللہ میں علم غیر نافع سے تیری پناہ مانگتا ہوں''۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ علم کا ایک درجہ یا ایک سطح ایسی ہوسکتی ہے کہ وہ غیر نافع ہو، اس کو علم کہا جاسکتا ہے اور وہ حقیقت سے کسی نہ کسی حد تک تعلق بھی رکھتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی عملی فائدہ نہیں ہے، لہٰذا اس کے حصول میں وقت ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو علم حصول کا مستحق ہے وہ ہے جو حقیقت کی صلب (یعنی core of reality) سے تعلق رکھتا ہو۔ یہی علم فرضِ عین ہے جو علم اس کے بعد والے دائرے سے تعلق رکھتا ہو، وہ فرضِ کفایہ ہوگا۔ علم و دانش اور ادب کا جو

www.KitaboSunnat.com

درجہ اس کے بھی بعد والے دائرے سے تعلق رکھتا ہوگا وہ ملح العلم کہلائے گا۔

جو علم فرضِ عین کی حیثیت رکھتا ہے اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

❶ ایک وہ ہے جس علم کے ذریعے انسان کا عقیدہ درست ہو جائے: ما تصح به العقیدة یعنی اسلام کے عقائد کا وہ کم سے کم علم جس کے نتیجے میں انسان کا عقیدہ اور طرزِ عمل درست ہو جائے۔ یعنی جدید مغربی اصطلاح (جرمن زبان) میں اسلام کا weltanschauung اس کے سامنے آجائے۔ یہ علم ضروری کا سب سے پہلا درجہ ہے کہ انسان یہ جان لے کہ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں، کیوں آیا ہوں، مجھے کہاں جانا ہے، میں اس دنیا میں کس کام کے لیے آیا ہوں؟ ان سوالات کے جوابات انسان کے پاس ہونے چاہئیں۔ اگر انسان کسی ذمہ داری پر یہاں بھیجا گیا ہے تو ذمہ داری کے تعین کے لیے ان بنیادی سوالات کا جواب ناگزیر ہے۔

دنیا میں انسان کی ذمہ داری: واضح رہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے انسان کو ایک ذمہ داری کے ساتھ روئے زمین پر بھیجا گیا ہے۔ قرآنِ مجید میں جہاں آدم کو روئے زمین پر اتارنے کا ذکر ہے وہاں هُبوط کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ هُبوط کے لفظ کو کچھ لوگوں نے fall کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں حضرت نوحؑ کے نزول کے سلسلہ میں کہا گیا ہے: اهبط بسلام منا وبرکت علیك یعنی ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ کشتی سے اُترو۔ گویا هبوط ہو رہا ہے اور پوری عزت کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ هبوط کے مفہوم میں سزا کا کوئی تصور نہیں ہے۔

اُترنے کے لفظ کا ترجمہ بعض مغربی مصنّفین نے fall کے نام سے کیا ہے۔ اُنہوں نے بائبل اور توریت کے تصورات کی روشنی میں اس کو دیکھا اور یہ سمجھا، گویا سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو جنت سے نکالا تھا۔ قرآنِ مجید میں کہیں بھی سزا کا ذکر نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں تخلیق آدم سے پہلے ہی یہ کہا گیا تھا کہ زمین میں ایک جانشین بنانا مقصود ہے:

﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ (البقرۃ:۳۰) لہٰذا زمین میں خلافت تو پیدائش سے پہلے سے متعین تھی۔ اس کے بعد کہا گیا کہ اهبطوا ''اُترو۔''

ڈاکٹر حمید اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جب انسان کہیں پہنچتا ہے تو اس کو بھی اُترنا کہتے ہیں۔ کراچی جا کر اُترے، لندن جا کر اُترے، مکہ مکرمہ جا کر اُترے۔ کئی جگہ قرآنِ مجید میں

www.KitaboSunnat.com

هُبوط کا لفظ کسی ذمہ داری کو انجام دینے کی غرض سے، چارج لینے کے سیاق وسباق میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہودیوں نے جب دعا کی کہ اللہ تعالیٰ! ارضِ مقدس کی حکومت ہمیں عطا فرما تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور یہودیوں کو ہدایت کی کہ

﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ﴾ (البقرة:٦١)

''اس شہر میں چلے جاؤ، جو مانگو گے ملے گا۔''

یہاں بھی هُبوط کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ هُبوط کا لفظ کسی سزا کے طور پر کہیں بلندی سے پستی میں پھینکے جانے کے لیے نہیں، بلکہ ایک قسم کی تشریف و تکریم کے ساتھ ذمہ داری سنبھالنے کے لیے پہنچ جانے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس لیے قرآنِ مجید میں ایسا کوئی تصور موجود نہیں ہے کہ جس کے نتیجے میں انسان کا وجود خود ایک جرم اور ایک سزا کی نوعیت رکھتا ہو۔ یہ حقائق ہر انسان کو معلوم ہونے چاہئیں اور یہ اس کے عقیدے کا لازمی حصہ ہیں۔ یہ سب ماتصح به العقيدة کا حصہ ہے۔

❷ فرضِ عین علم کا دوسرا درجہ ہے: ماتصح به العبادة، یعنی علم کا اتنا حصہ جس کی مدد سے عبادت درست طور پر ادا ہو سکے۔ ہر انسان کچھ نہ کچھ عبادات کا مکلّف ہے۔ نماز ہر ایک پر فرض ہے۔ روزہ ہر صحت مند بالغ مسلمان پر فرض ہے۔ زکوٰۃ فرض ہے صاحبِ نصاب پر وغیرہ ۔ لہٰذا شریعت کے احکام کا اتنا علم کہ انسان کی عبادات درست طریقے سے انجام پا جائیں، یہ فرض عین ہے۔

❸ اس کے بعد ہے ماتصح به المعيشة، یعنی انسان جو زندگی گزارتا ہے، اس زندگی گزارنے کا شریعت کے مطابق جو کم سے کم ڈھنگ ہے، وہ اس کو آ جائے۔ زندگی گزارنے کا ڈھنگ مختلف میدانوں میں مختلف ہوتا ہے۔ تاجر کا ڈھنگ اور ہے، کاشتکار کا ڈھنگ اور ہے، اُستاد اور معلم کا ڈھنگ اور ہے۔ جو شخص جس میدان میں کارفرما ہے، اس کو نہ صرف اس میدان سے متعلق شریعت کے بنیادی احکام سے باخبر ہونا چاہیے بلکہ خود اس فن کے احکام بھی اس کو آنے چاہئیں۔

یہ سمجھنا کہ میں اگر مسلمان میڈیکل ڈاکٹر ہوں تو شریعت کے احکامات کا تو پابند ہوں، لیکن

www.KitaboSunnat.com

میڈیکل فن کے قواعد کا پابند نہیں ہوں، یہ درست نہیں ہے۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ میڈیکل پیشہ کے رائج الوقت معروف احکام اور قواعد کی پابندی شریعت کا حکم نہیں ہے۔ شریعت یہ بھی حکم دیتی ہے کہ اگر میں فن طب کو بطورِ پیشہ اختیار کروں تو مجھے اس میدان کے قواعد کا علم ہونا چاہیے اور اس زمانہ کے لحاظ سے ہونا چاہیے جس زمانے میں میں میڈیکل سائنس کو پریکٹس کر رہا ہوں۔ ایک حدیث میں ہے کہ

''اگر کسی شخص نے علم طب سیکھے بغیر کسی کا علاج کیا، اور اس کو کوئی نقصان ہوگیا تو اس نقصان کا یہ علاج کرنے والا شخص ذمہ دار ہوگا۔'' ( )

یہ اس نقصان کا تاوان ادا کرے گا۔ بعض فقہا نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عطائی کے ہاتھوں غلط علاج کے نتیجہ میں معذور ہو جائے یا مر جائے تو عطائی کو دیت ادا کرنی پڑے گی۔ اس سے پتا چلا کہ اس فن کے فنی احکام کو جاننا بھی اس فن کو اختیار کرنے والے پر فرضِ عین ہے اور اس فن سے متعلق شریعت کے احکام کو جاننا بھی اس فن کے مدعی پر فرضِ عین ہے۔

فرضِ کفایہ 'علم'

یہ تو علم کا وہ کم سے کم دائرہ ہے جو ہر شخص کو حاصل ہونا چاہیے۔ دوسرا دائرہ فرضِ کفایہ کا ہے جس کے بارے میں فقہاے اسلام نے بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ، امام غزالیؒ اور کئی دوسرے حضرات نے یہ بات لکھی ہے کہ ان تمام علوم وفنون سے واقفیت مسلمانوں کے لیے فرضِ کفایہ کی حیثیت رکھتی ہے جو امت مسلمہ کو دوسروں کا محتاج ہونے سے بچانے کے لیے ناگزیر ہیں۔ چنانچہ ان تمام صنعتوں کا علم اور ان فنون کا علم جن کی مسلمانوں کو ضرورت ہے، فرضِ کفایہ ہے۔ مسلمان کو اپنی تجارت میں، اپنے دفاع میں، اپنی آزادی اور استقلال کو برقرار رکھنے میں جس جس فن اور مہارت کی ضرورت ہو، اس کا حصول فرضِ کفایہ ہے۔ پھر امام غزالی نے اس پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ بہت سے لوگوں نے ان علوم میں دلچسپی لینا کم کردی ہے۔ امام غزالی کا حوالہ میں بار بار اس لیے دے رہا ہوں کہ ان کو کسی دنیادار آدمی کے طور پر نہیں جانا جاتا، بلکہ ایک خاصے شدت پسند مذہبی انسان کے طور پر ان کا تعارف ہے، بلکہ خود بہت سے اہل علم نے، یہاں تک کہ اسلام کے بعض ذمہ دار ترجمانوں اور مستند شارحین نے بھی امام غزالی کے خیالات کو قدرے انتہا پسندانہ قرار دیا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

امام غزالی کا کہنا یہ ہے کہ اس غفلت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہر شخص نے سمجھا کہ دوسرے لوگ یہ علم حاصل کرلیں گے اور میں اس سے بری الذمہ ہو جاؤں گا۔ چنانچہ لوگ فقہ کا علم حاصل کرنے پر تو توجہ دیتے ہیں۔ طب کا علم حاصل کرنے پر توجہ نہیں دیتے۔ لوگ شریعت کا علم تو ذوق وشوق سے حاصل کرتے ہیں، لیکن انڈسٹری کا علم حاصل نہیں کرتے۔ اس لیے کہ شریعت اور فقہ کا علم حاصل کرنے سے بڑے بڑے مناصب ملتے ہیں۔ قاضی کا عہدہ ملتا ہے، مفتی کا عہدہ ملتا ہے۔ شاید اس زمانے میں لوگ کثرت سے علومِ شرعیہ کی طرف آتے ہوں گے۔ آج ہمارے یہاں اسلامک یونیورسٹی کی فیکلٹی آف شریعہ میں داخلے کے لیے اگر سوطلبہ آتے ہیں تو مینجمنٹ سائنسز میں داخلے کے لیے پانچ ہزار درخواست گزار آتے ہیں۔ اس لیے کہ ایم بی اے کرنے سے اچھی نوکری ملتی ہے۔ شریعت اور اُصول الدین پڑھنے سے نوکری نہیں ملتی۔

اسلامی معاشروں میں اس کے برعکس ہوتا تھا کہ علم دین پڑھنے والے کو اچھی نوکریاں ملتی تھیں۔ قضا، فتویٰ اور فقہ کی تربیت کے لیے طالبانِ علم بڑی تعداد میں امام غزالی کے مدرسہ نظامیہ میں آتے تھے۔ طب پڑھنے کے لیے نہیں آتے تھے، اس لیے کہ طب کی بنیاد پر وزارت بھی نہیں ملتی تھی، قضا بھی نہیں ملتی تھی اور مفتی کا عہدہ بھی نہیں ملتا تھا۔

بہرحال اس سے یہ پتہ چلا کہ وہ تمام تخصّصات حاصل کرنا فرضِ کفایہ ہے جو اُمتِ مسلمہ کے دفاع اور وجود و استقلال کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان دو درجات کے تحت آنے والے علوم وفنون کے علاوہ جتنے بھی علوم ہیں وہ ملح العلوم یا علمی نکتے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر معاشرے میں کچھ لوگ ان علوم کو حاصل کریں تو اچھی بات ہے، تہذیبی اور تمدنی ترقیاں اس سے حاصل ہوتی ہیں۔ بہت سے سوشل سائنسز ہیں، ہیومنیٹیز کے معاملات ہیں۔ اگر کچھ لوگ معاشرے میں خطاطی کا پیشہ اختیار کرتے ہیں، کچھ لوگ معاشرے میں اس طرح کے کچھ اور پیشے اختیار کرلیں تو اس سے تہذیب وتمدن میں وسعت پیدا ہوگی۔ تہذیب وتمدن میں مزید ترقی ہوگی۔ لیکن اگر پوری قوم خطاطی یا فنونِ لطیفہ اور شعروشاعری میں لگ جائے تو پھر بقیہ معاملات متاثر ہوں گے اور اُمتِ مسلمہ غیر مسلموں کی محتاج ہوجائے گی۔ اس لیے امام غزالی نے اس پر بہت تفصیل سے اظہارِ خیال بلکہ اظہارِ افسوس کیا ہے کہ مسلمانوں نے فرضِ عین اور فرضِ کفایہ کی اس تقسیم کو نظرانداز کردیا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

تعلیم وتعلم

مولانا محمد بشیر☆

اسلامی مدارس اور تعلیم وتربیت کی خشتِ اوّل

عربی زبان دین اسلام کی پہچان اور شعار ہے کیونکہ اس میں ہماری آخری اور ابدی کتاب 'قرآنِ کریم' نازل ہوئی، اور ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی زبان یہی تھی۔ آپ اور ان کے صحابہ عرب تھے۔ قرآنِ کریم کی طرح ان کی تمام احادیث کا ذخیرہ اور آپ کی سیرتِ مبارکہ اسی زبان میں ہے۔ یوں ہمارے دین اسلام کی تمام تعلیمات کی اصل زبان یہی ہے اور ہماری عبادات کے تمام اذکار، دعائیں اور آداب بھی اسی عربی زبان میں ہیں۔

ہر مسلمان عربی سیکھتا ہے!

عربی زبان کی اس دینی اور شرعی اہمیت کی وجہ سے ہر باشعور مسلمان اسے سیکھتا ہے، اور کسی نہ کسی شکل میں اسے بولتا بھی ہے۔ ہمارے اس خطے کے مسلمان خاندانوں میں ایک اچھی روایت نسلوں سے چلی آرہی ہے کہ وہ اپنے ننھے بچوں کو شعوری عمر کو پہنچتے ہی ان کی خواندگی کا آغاز قرآنِ کریم کی تعلیم دینے سے کرتے ہیں، جس کی ابتدا تعلیم قرآن کے ابتدائی اور تمہیدی قاعدے..... بغدادی قاعدے یا قاعدہ یَسَّرنا القرآن یا نورانی قاعدے..... کی تدریس سے ہوتی ہے۔

بچہ اس تمہیدی قاعدے کو دو یا تین سال مسلسل محنت سے پڑھتا رہتا ہے اور عربی حرفوں کی مفرد اور مرکب شکلوں نیز ان کی حرکات کی متنوع صورتوں اور استعمالات کی مشق کرتے ہوئے قرآنِ کریم کے الفاظ، مرکبات، جملوں اور آیات کی قرات سیکھتا ہے اور وقف اور وصل کے اُصولوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ یوں ہمارے بچے تین یا چار سال کی عمر کو پہنچتے ہی قرآنِ کریم کی عربی زبان کو سیکھنا شروع کردیتے ہیں اور وہ اسے صحیح پڑھنے اور بولنے کی صلاحیت حاصل کرلیتے ہیں۔

☆ پرنسپل مَعہد اللغة العربیة، اسلام آباد

اس تمہیدی قاعدے کو پڑھنے کے بعد یہ خوش نصیب بچے قرات کے اِنہی اصولوں کے مطابق قرآنِ کریم کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھنے کی مشق اور تربیت لیتے ہیں جسے ناظرہ قرآنِ کریم کی خواندگی کہا جاتا ہے۔ اس میں وہ ایک یا دو سال مسلسل محنت کرتے ہیں۔

اس ناظرہ قرآنِ کریم کورس کے دوران وہ کئی منتخب سورتوں کو زبانی بھی یاد کرتے ہیں، نیز مکمل نماز کے اذکار، اذان اور دیگر مواقع پر پڑھے جانے والے اذکار اور دعاؤں کو بھی ازبر کرلیتے ہیں۔ اس مدت میں بچے قرآن کریم کی آسان اور سلیس عربی زبان میں جب اللہ تعالیٰ کے ارشادات اور آیات کو بار بار اور تکرار سے پڑھتے اور دہراتے رہتے ہیں، تو ان کے دلوں اور ذہنوں میں قرآنی الفاظ، مرکبات، محاورے اور جملے بلکہ پوری پوری آیات پختہ اور محفوظ ہوجاتی ہیں۔ وہ رفتہ رفتہ تیس پاروں پر مشتمل قرآنِ کریم کی لغت عربی کے عظیم اور وسیع ذخیرے سے اچھی طرح مانوس اور واقف ہوچکے ہوتے ہیں۔

اسلامی تعلیم وتربیت کا اچھا آغاز

مسلمان بچوں کی اسلامی تعلیم وتربیت کا یہ پہلا کورس جو بغدادی قاعدے اور ناظرہ قرآنِ کریم پر مشتمل ہے، ایک جامع اور مفید کورس ہے کیونکہ اس میں ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت کا بامقصد اور جامع پروگرام دیا گیا ہے جو درج ذیل بنیادی اور ضروری نکات کو شامل ہوتا ہے:

- کتاب اللہ کی قرات کے ضروری قاعدوں کی تعلیم اور مشق
- کتاب اللہ کی صحیح اور پختہ تلاوت کی نظری اور عملی تربیت
- اسلام کے پہلے دو بنیادی ارکان: شہادتین اور نماز کی تعلیم اور عملی تربیت
- بنیادی اسلامی آداب کی تعلیم وتربیت
- عربی زبان کے بنیادی الفاظ، ترکیبوں، محاوروں اور جملوں کو پڑھنے، بولنے کی پختہ تربیت

اور پھر بچے اسے جس یکسوئی، شوق اور توجہ سے پڑھتے ہیں اور فرفر سناتے ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی تین چار سال کی مسلسل محنت اور ریاضت کے نتیجے میں اسلامی تعلیم وتربیت کے مذکورہ بالا مضامین میں ایسی اچھی استعداد اور صلاحیت حاصل کرلیتے ہیں جسے بنیاد بنا کر اگلے تعلیمی مرحلے میں ان کی بہتر اور معیاری تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔

سالِ اوّل کے پہلے مضمون میں جمود

اس کے بعد بچوں کی ایک بڑی تعداد عربی زبان سیکھنے اور اسلامی تعلیم کے حصول کی غرض سے اسلامی مدارس میں داخل ہوتی ہے جہاں وہ سالِ اوّل کا تعلیمی نصاب پڑھتے ہیں۔ جس کا سب سے اہم اور پہلا مضمون ترجمہ قرآنِ کریم کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی تدریس یوں ہوتی ہے کہ سبق کے آغاز پر ایک طالب علم مقررہ آیاتِ کریمہ تلاوت کرتا ہے، پھر معلم ان کا مقامی زبان میں ترجمہ سکھاتا ہے۔ وہ ان کا ترجمہ کرتے ہوئے ان میں مذکور مشکل الفاظ اور ترکیبوں کی حسبِ ضرورت تشریح بھی کرتا جاتا ہے۔ طلبہ اس ترجمہ اور تشریح کو نہایت توجہ اور انہماک سے سنتے اور یاد کرلیتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی تعلیم وتدریس کے اس نہج سے اُنہیں متعدد تعلیمی وتربیتی فوائد حاصل ہوتے ہیں:

① وہ قرآنِ کریم کی آیات کا معنی اور ترجمہ سیکھ لیتے ہیں۔

② وہ قرآنِ کریم کے فہم ومطالعہ کی قدرت حاصل کرکے اس کے ارشادات اور احکام کو خود سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کے اہل ہوتے ہیں۔

③ وہ قرآنِ حکیم کے الفاظ اور تراکیب کی لغوی اور صرفی ونحوی تشریح سے واقف ہوتے ہیں۔

ترجمہ قرآنِ کریم کی ایسی تدریس سے ہمارے بچوں، نوجوانوں اور علماء کو مذکورہ بالا فوائد اور نتائج حاصل ہوتے ہیں لیکن یہ فوائد محدود اور ناکافی ہیں، اور ہمارے عزیز بچوں کی اعلیٰ اور معیاری تعلیم وتربیت کے تمام اہداف اور مقاصد کا احاطہ نہیں کرتے۔ اس لیے یہ طریقۂ تدریس کچھ مفید ہونے کے باوجود ناقص ہے۔ اور اس ناقص اور جامد طریقۂ تدریس کا تسلسل زیرِ تعلیم طلبہ میں جمود پیدا کرتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری درسگاہوں میں تعلیم قرآنِ کریم کا یہ عظیم ترین مضمون اس کی آیاتِ کریمہ کا لفظی ترجمہ رٹنے اور رٹانے تک محدود رہتا ہے اور تین چار سال تک کسی تبدیلی یا ترقی کے بغیر اسی نہج پر چلتا رہتا ہے، اور ایسا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا کہ اس کی تدریس کے دوسرے سال یا اگلے سالوں میں، جب زیرِ تعلیم طلبہ کی تعلیمی صلاحیت اور فکری وعلمی معیار بڑھ جاتے ہیں اس کے تدریسی نہج کو ترقی دیتے ہوئے اس میں مزید تعلیمی وتربیتی مقاصد کو شامل کرلیا جائے۔

ترجمے نے سب کو عربی زبان سے لاتعلق کر دیا!

اس جامد طریقہ تدریس نے ہمارے پورے تعلیمی ڈھانچے کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ درسِ نظامی کے تمام مضامین کی تدریس، شروع سے سے لے کر آخر تک اسی نہج پر ہوتی ہے۔ اس نے ہمارے تمام طلبہ، طالبات، مدرسین اور علماء کو قرآنِ کریم کی زبان ـــ لسانِ عربی مبین ـــ سے لاتعلق کیا ہوا ہے۔ وہ اس کے فہم ومطالعہ سے محروم رہتے ہیں اور اُنہیں قرآن کریم کے الفاظ، ترکیبوں، محاوروں اور استعمالات میں تدبر اور غور وفکر کی تربیت دی جاتی ہے، نہ ان کے لکھنے اور بولنے اور متنوع استعمالات کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس طرح وہ کتاب اللہ کے حافظ اور عالم ہونے کے باوجود عربی زبان میں کوئی صلاحیت حاصل نہیں کر پاتے۔ یوں قرآنِ کریم کی تعلیم وتدریس میں اس جمود اور کاہلی نے عرصہ دراز سے ہمارے عزیز بچوں، نوجوانوں، مدرّسین، علماء، مفکرین اور تمام تعلیم یافتہ طبقوں کو عربی زبان سے لاتعلق اور محروم رکھا ہے۔ اس لیے یہ طریقۂ تدریس، جو ہمارے ملک اور خطے کے تمام ممالک کے اسلامی مدارس میں جاری وساری ہے ناقص اور مضر ہے۔ ضرہ أکبر من نفعہ! اس کے دیگر مضر اثرات کی مزید تفصیل دوسری جگہ ملاحظہ کریں:

چنانچہ سال اوّل کا یہ نقص اگلے تعلیمی مراحل میں بھی تعلیم وتربیت کے مقاصد کو متاثر کرتا ہے اور پورے درسِ نظامی کو سال اوّل سے لے کر سالِ ہشتم تک عربی زبان وادب سے لاتعلق رکھتا ہے، اور اس پر عظیم مفکر شیخ سعدی رحمہ اللہ کا یہ شعر صادق آتا ہے: ع

خشتِ اوّل چونہد معمار کج　　تا ثریا می رود دیوار کج

خشتِ اوّل کو سیدھا کریں

یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے کہ قرآنِ کریم کی عربی زبان نہایت آسان اور سلیس ہے اور اس کی آیاتِ کریمہ میں آسان اور مشہور لفظوں، مختصر اور عام فہم محاوروں، ترکیبوں اور جملوں کا استعمال بکثرت ہوا ہے۔ ہم زیر تعلیم بچوں کے مرحلے اور معیار کے مطابق ان سے ایسا انتخاب کر سکتے ہیں جو اُنہیں قرآنی عربی زبان کے فہم، نطق، تحریر اور سماع کی اچھی تربیت دے اور انہیں گرامر کی بھول بھلیوں میں نہ ڈالے۔ اس طرح بچے قرآن کریم کے ترجمہ یا فہم ومطالعہ کے ساتھ ساتھ اس کے عربی لغت کے فہم ومطالعہ، بول چال اور تحریر کی تربیت پائیں گے اور

سال اوّل ہی سے عربی زبان کے پڑھنے بولنے اور لکھنے کی مشق کرنے لگیں گے جو ان کے ذہنوں اور دلوں میں عربی زبان وادب کے اچھے ذوق کی بنیاد بنے گی۔

یہ ہمارے مدارس میں اسلامی تعلیم کا پہلا سال ہے۔ کمسن بچے بڑے شوق سے اور اچھے اچھے جذبوں کے ساتھ عربی زبان سیکھنے اور اسلامی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آتے ہیں اور اپنا تعلیمی سفر شروع کرتے ہیں۔ یہ ان کی بہتر تعلیم اور عمدہ تربیت کی بنیاد رکھنے کا سنہری وقت ہوتا ہے۔ آیئے ہم اس کا آغاز قرآن کریم کی معیاری اور مثالی تعلیم سے کریں۔

بچے خواہ مدارس کے عربی کورس میں داخلہ لیں یا تجوید القرآن الکریم کورس یا تحفیظ القرآن الکریم کورس میں داخل ہوں ان سب کو ان کے اپنے اپنے مضمون ترجمہ قرآنِ کریم رتجوید رتحفیظ کے ساتھ ساتھ لغتِ قرآن کریم کی تعلیم وتربیت ضرور دی جائے۔

کمسن بچوں کو قرآنی عربی زبان کی تعلیم دینا آسان ہے

ہم سب جانتے ہیں کہ اسلامی مدارس کے طلبہ خواہ قرآن کریم کا ترجمہ پڑھتے ہوں یا اسے حفظ کرتے ہوں یا اس کی تجوید وقرات کی تعلیم وتربیت پا رہے ہوں، وہ سب قرآنی آیات اور سورتوں کو باربار اور تکرار سے پڑھتے رہتے ہیں۔ اس لیے اُنہیں قرآنِ کریم کے الفاظ، ترکیبات، استعمالات اور جملے زبانی یاد ہوجاتے ہیں۔ یوں اس تعلیمی مشق کے دوران ان کے ذہنوں میں عربی زبان کا 'نہایت وسیع اور عمدہ ذخیرۂ لغت' محفوظ ہوجاتا ہے۔ یہ محفوظ ذخیرۂ لغت ان بچوں کو عربی زبان کی تعلیم وتربیت دینے کی اچھی بنیاد بن سکتا ہے۔

اس 'وسیع اور عمدہ ذخیرۂ لغت' کو محفوظ کرنے والے ان طلبہ کے فکری پہلو پر بھی غور کریں۔ وہ دین اسلام کے طلبہ ہیں اور اس کے سچے عقائد اور پختہ احکام وآداب کی تعلیم پا رہے ہیں۔ نتیجتاً وہ وسیع فکر ونظر کی تربیت حاصل کررہے ہیں۔ الغرض وہ لسانی اور فکری دونوں پہلوؤں سے عمدہ تعلیم وتربیت لینے کے اہل ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ اُنہیں عربی زبان کی عمدہ اور موٴثر تعلیم وتربیت دینے کا بہت سنہری موقع ہوتا ہے۔

عربی زبان کی تدریس کا موزوں ترین موقع

بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ بغدادی قاعدہ رٹنے کے بعد قرآنِ کریم حفظ کرنے والے بچوں کے لیے عربی زبان کی تدریس کا یہ ایک آسان اور عمدہ موقع ہوتا ہے جس کی مثال

دوسری زبانوں کے تدریسی پروگراموں میں نہ ملے گی۔ اب یہ ہمارے تعلیمی نظام، مدارس اور معلّمین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس آسان، مثالی اور عمدہ موقع سے استفادہ کرتے ہوئے اُن کے لیے عربی زبان کی اچھی اور عمدہ تدریس کا اہتمام کریں۔

قرآنی عربی زبان کی تعلیم کیسے دی جائے؟!

میں اپنی تجاویز کے مطابق پہلے سورہ فاتحہ کی تدریس کی مثال☆ بیان کرچکا ہوں، اب یہاں سورہ بقرہ کی پہلی پانچ آیاتِ کریمہ کی تدریس کی مثال پیش کرتا ہوں:

ا. شرح الکلمات

معلم ہر سبق کے شروع میں مقررہ آیاتِ کریمہ کے الفاظ اور ترکیبوں کی لغوی تشریح کو تختۂ سیاہ پر لکھے تاکہ بچے اسے یاد کریں اور اپنی کاپیوں میں درج کریں:

سُورة	سورت	ج سُوَر	الصَّلٰوة	نماز	ج صَلَوات
ذٰلِكَ	وہ	ج أُولٰئك	رَزَقْنٰهُمْ	ہم نے اُنہیں دیا	
الْكِتٰبُ	کتاب	ج كُتُب	رَزَقَ يَرْزُقُ رِزْقًا	دینا	
هُدًى	ہدایت	هَدٰى يَهْدِي هُدًى	يُنْفِقُوْنَ	وہ خرچ کرتے ہیں	
لِلْمُتَّقِيْنَ	پرہیزگار	م مُتَّقِي	أنفَقَ يُنفِق اِنفاقًا	خرچ کرنا	
يُؤْمِنُوْنَ	وہ ایمان لاتے ہیں		يُوْقِنُوْنَ	وہ یقین کرتے ہیں	
آمَنَ يُؤْمِن اِيماناً (ب)	ایمان لانا		أيقَن يُوقِن اِيقانا	یقین کرنا	
يُقِيْمُوْنَ	وہ قائم کرتے ہیں		الْمُفْلِحُوْنَ	فلاح پانے والے	
أَقَامَ يُقِيْمُ	اقامة قائم کرنا		م مُفلِح		

☆ موصوف کا اسی موضوع پر ایک مضمون اس سے قبل 'محدث' کے جولائی ۲۰۰۸ء کے شمارے میں بعنوان ''دینی مدارس میں تعلیم قرآن کا جامع اور صحیح طریقہ'' شائع ہوچکا ہے جس میں اسی اُسلوبِ تدریس کی تلقین کرتے ہوئے سورۃ الفاتحہ کی تدریس کی عملی مشق دی گئی تھی۔ اسی کی طرف یہاں اشارہ کیا جارہا ہے، مزید تفصیل کے لئے محولہ بالا شمارے کا مضمون ملاحظہ کریں۔

عربی زبان کی بہتر تدریس اور فہم قرآن کے ایک نئے طریقے کی تربیت کے لئے اس سے قبل بھی ماہنامہ 'محدث' کے شمارہ جنوری ۲۰۰۵ء میں ڈاکٹر عبدالکبیر محسن، اسلام آباد کا ایک تفصیلی مضمون شائع ہوچکا ہے جسے بعد میں ایک کتابچہ میں مکتبہ اسلامیہ، اردو بازار لاہور نے بعنوان: 'عربی آسان ہے' شائع بھی کردیا ہے۔ مدیر

2. ترجمة الآيات وشرحها

اس کے بعد معلم ان آیاتِ کریمہ کا مقامی زبان میں ترجمہ کرے گا اور بچوں کے معیار کے مطابق ان کی تشریح کرے گا۔

3. التمرينات المتنوعة

اب معلم ان آیات کریمہ پر متنوع سوالات کو حل کرنے کی مشقیں زبانی اور تحریری دونوں طرح حل کرائے:

١) اكتب أضداد الكلمات الآتية ويكون الجواب

مدنية	ضدها مكية
الكافر	ضده المؤمن
الدنيا	ضدها الآخرة
الغيب	ضده الشهادة
السماء	ضدها الأرض
أمام	ضده خَلف
قبل	ضده بعد

٢) املإ الفراغ بكلمة مناسبة فيما يأتي:

١- سورة الفاتحة..... وسورة البقرة مدنية

٢- المؤمنون يؤمنون .....

٣- ويُقيمون .....

٤- ويُنفقون ..... أموالهم

٥- ويُؤمنون ..... أنزل على محمد ﷺ

٦- ويُؤمنون ..... أنزل من قبله

٣) املإ الفراغ بكلمة مناسبة فيما يأتي:

١- هو آمَنَ بالله ٢- هما ..... بالله

٣- هم .... ٤- هِيَ ....

٥- هُمَا ....
٦- هُنَّ ....
٧- أنا ....
٨- نَحْنُ ....

(٤) أجب عما يأتي:

١- من خَلَقَنا ؟
٢- من خَلَق السماء؟
٣- من خَلَق الأرض؟
٤- من خَلَق العالم؟
٥- من أنـزَل القرآن الكريم؟
٦- على مَن أُنزِل القرآن ؟

(٥) لَخِّص معنى هذه الآيات الكريمة بعبارتك :

الجواب: ذكر الله سبحانه وتعالى في هذه الآيات الكريمة أنه أنـزل هذا القرآن ليهدي الناس إلى الصراط المستقيم، وذكر خمس صفات لعباده المؤمنين، وهي:

١- أنهم يؤمنون بالغيب،
٢- ويقيمون الصلاة،
٣- وينفقون من أموالهم في سبيل الله،
٤- ويؤمنون بالآخرة،
٥- ويؤمنون بما أنـزل على محمد ﷺ وما أنـزل قبله .

وهؤلاء هم على الحق وهم المفلحون..... اللهم اجعلنا منهم، آمين!

فوائد: آپ دیکھتے ہیں کہ اس طریقۂ تدریس میں زیرِ تعلیم بچے ترجمہ قرآن کے ساتھ ساتھ پہلے مقررہ آیاتِ کریمہ میں مستعمل الفاظ کی اچھی لغوی تشریح لکھتے اور یاد کرتے ہیں اور پھر قرآنِ کریم کی لغت کو لکھنے، بولنے اور سننے کی متنوع اور عمدہ مشقیں کرتے ہیں جو ان کے ذہنوں میں عربی زبان وادب کی اچھی بنیاد بنے گی، اور کتاب اللہ کے اعلیٰ فہم وتدبر کی اہلیت پیدا ہوگی جو مستقبل میں ان کی تعلیمی اور علمی ترقی کا ذریعہ ہوگی۔

شعبۂ تجوید اور تحفیظ میں تین پاروں کی تدریس کرائی جائے

ہماری درسگاہوں میں اس وقت شعبہ تحفیظ القرآن الکریم اور شعبہ تجوید القرآن الکریم کے طلبہ کو کسی طرح کے فہم کے بغیر قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ عمر بھر اس کے فہم سے محروم رہتے ہیں اور امام اور 'مقری' مقرر ہونے کے بعد بھی اس کی لغت اور معانی کو سمجھے بغیر پڑھتے پڑھاتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ تمام علماء اور معلّمین تسلیم کرتے ہیں، یہ امر کسی طرح بھی مستحسن نہیں ہے۔ اس لئے ان دونوں شعبوں کے طلبہ کو

بھی کم از کم تین پاروں کی تدریس ضرور کرائی جائے۔

میرے اس مجوزہ طریقۂ تدریس پر عمل کرنے سے ان کے ذہنوں میں قرآنِ کریم کے اچھے فہم و مطالعہ کی راہ ہموار ہوگی جس سے اُنہیں ان مضامین یعنی تجوید اور حفظ میں بھی بڑی آسانی ہوجائے گی کہ وہ اب قرآنِ کریم کو سمجھ کر پڑھیں گے تو نسبتاً کم مدت میں حفظ کرسکیں گے اور فراغت کے بعد مستقبل میں اپنی ذمہ داریوں کو فہم و بصیرت کے ساتھ ادا کرنے کے اہل ہونگے، اور ضرورت کے وقت آسانی سے علوم اسلامیہ کے شعبوں میں داخلہ لے کر مزید ترقی کرسکیں گے۔

میں اپنے طویل غور و فکر اور تجربات کی روشنی میں تعلیم و تربیت کی یہ تجویز اسلامی مدارس کے اربابِ اختیار، مدرّسین، علماء اور وفاقوں کے افسرانِ بالا کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ یہ تجویز آسان اور قابل عمل ہے۔ اس کے نفاذ سے ہمارے اداروں کے تعلیمی نظام میں ایسا انقلاب آئے گا جو ان کی ترقی کا ذریعہ بنے گا اور ہمارے فاضل اساتذہ اور معلمین بھی اس سے مستفید ہوں گے۔ إن شاء الله تعالىٰ وهو الموفق والمستعان!

کیا یہ طریقۂ تدریس قابل عمل ہے؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے اسلامی مدارس اور جامعات کے موجودہ حالات میں، جب ہمارے معلّمین اور طلبہ میں بالعموم عربی زبان بولنے اور لکھنے کا ذوق ناپید ہے اور ہمارے ملک اور ماحول میں ایسی کتابیں اور گائیڈز بھی موجود نہیں ہیں جو تعلیم و تدریس کے اس جدید طریقے میں معاون اور مفید ہوں، تو ہم اس طریقۂ تدریس پر عمل کیسے کریں؟

اُصولی طور پر یہ طریقۂ تدریس آسان، فطری اور قابل عمل ہے۔ پہلے ہمیں اپنے فاضل اور محنتی معلّمین اور طلبہ کو اس کے فوائد اور دور رس نتائج اور ثمرات سے آگاہ کرتے ہوئے اس کے نفاذ اور ترویج کی اہمیت کو واضح کرنا چاہئے۔ معلّمین کو دعوت دی جائے بلکہ اُنہیں شوق اور ترغیب دی جائے کہ وہ اپنی عظیم درسگاہوں، اور اپنے عزیز بچوں کی ترقی کے اس پروگرام پر عمل کرنے کی تیاری کریں اور اپنے ماحول اور ادارے میں عربی زبان کو بولنے اور لکھنے کی روایت اور صلاحیت کو بیدار کریں۔ ان میں یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے لیکن کبھی استعمال نہ کرنے سے خوابیدہ رہتی ہے۔ اُصولی طور پر تو یہ حضرات قرآنِ کریم کے وسیع ذخیرۂ لغت کے حافظ ہوتے ہیں، اس کے علاوہ وہ حدیثِ شریف کی صحاحِ ستہ، عظیم فقہی متون، عربی زبان

وادب کی متنوع کتابوں کے سمندر ناپیدا کنار کے عالم وفاضل ہوتے ہیں اور اُنہیں اس سمندر کے ہیروں ایسے بے شمار محاورے، استعمالات، جملے، اصطلاحات، لطیفے اور اشعار اور عبارتیں ازبر ہوتے ہیں۔ ان کی اس عظیم لسانی اور فکری اہلیت وصلاحیت کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس بارے میں ہمارے اداروں، منتظمین اور اساتذہ کو خواہ مخواہ احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ پورے شوق اور عزم کے ساتھ محنت سے اس نقص کا ازالہ کرنا چاہئے۔ اس بارے میں مزید تجاویز یہ ہوسکتی ہیں:

① اپنے ادارے مین ایک دو گھنٹے کا ایسا وقت مقرر کردیں جس میں تمام معلّمین اور زیر تعلیم بچے صرف عربی زبان میں ہی بات کریں مثلاً بعد صلاة المغرب حتی صلاة العشاء یا صبح من بعد صلاة الفجر حتی الساعة الثامنة۔ منتظمین ایسے کسی پروگرام کی سرپرستی کریں اور معلّمین اور طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اُنہیں معاون کتابیں اور گائیڈز فراہم کریں۔ اس بارے میں ہمارا رسالہ كلمات مستعملة في بيئة مدرسية (درسگاہ کے ماحول میں مستعمل عربی الفاظ اور محاوروں کا انتخاب) للبنين يا للبنات مفيد رہے گا۔

② قرآنِ کریم کی تعلیم کے سبق میں اس طریقۂ تدریس کو فوراً شروع کردیں۔ اس کی تدریس کو زیادہ سے زیادہ مؤثر اور دلچسپ بنانے کے لئے اس کی ایک دن پہلے تیاری کرکے آئیں۔ شروع میں کافی دقت پیش آئے گی اور کچھ غلطیاں ہوں گی۔ ان سے بددل نہ ہوں۔ راہنمائی کے لئے ہماری کئی مطبوعات مثلاً مفتاح الإنشاء: الجزء الأول والجزء الثاني معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ ان شاء اللہ!

③ ہر معلم سے درخواست کریں کہ وہ کم از کم اپنا ایک سبق عربی زبان میں ضرور پڑھائے جس سے ان کی اپنی صلاحیت میں اضافہ ہوگا اور بچوں کی تربیت اور مشق ہوگی۔

مرشد تدریس القرآن کی تیاری

آخر میں یہ خوشخبری دینا چاہتا ہوں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے معهد اللغة العربية میں کئی سال سے اسی طریقۂ تدریس کے مطابق قرآن کریم کی تدریس کررہے ہیں اور معلّمین کے لئے اس کی گائیڈ 'مرشد تدریس القرآن الکریم' کی تیاری کا کام ہورہا ہے جس کے پہلے اجزاء آئندہ چار پانچ ماہ تک طبع ہوجائیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ وبیدہ التوفیق!

انکارِ حدیث

حافظ پروفیسر ڈاکٹر محمد دین قاسمی

غلام احمد پرویز کے ایمان بالقرآن کی حقیقت

شیطان اس حقیقت سے خود واقف ہے کہ وہ اپنی دعوتِ ضلالت کو ضلالت کے نام سے اگر پیش کرے گا تو وہ ہرگز قابل قبول نہ ہوگی، چنانچہ وہ ہمیشہ یہ حربہ اختیار کرتا رہا ہے کہ وہ گمراہی کو ہدایت کے روپ میں پیش کرے۔ جھوٹ کو لباسِ صدق پہنائے، بے دینی کو دین کے بھیس میں سامنے لائے اور خلقِ خدا کو دھوکہ دینے کے لئے فریب کار کی بجائے ناصحِ درد مند کا بہروپ اپنائے۔ اگر وہ فساد کو صلاح کا نقاب نہ اوڑھے اور خود بے نقاب ہوکر سامنے آئے تو کوئی اس کے فریب میں نہ آئے۔ وہ اپنی شیطنت کو پارسائیت کے پردے میں پیش کرتا ہے اور یوں وہ ابنائے آدم کو اپنی مفاد پرستیوں کی بھینٹ چڑھاتا ہے۔ اس تکنیک سے وہ بنی نوع انسان کو جس تباہی و بربادی سے ہم کنار کرتا ہے اس کے سامنے ہلاکو اور چنگیز خان تو رہے ایک طرف، ہٹلر اور امریکی بُش کی تباہیاں بھی ماند پڑ جاتی ہیں۔

نہ صرف تاریخ انسانیت بلکہ اسلام کی سرگذشت بھی اس حقیقت پر شاہد ہے کہ ہر عصر و مصر میں ملحد اور بے دین لوگوں نے ہدایت کے نام پر ضلالت کو، اسلام کے نام پر بے دینی کو، سچ کے نام پر جھوٹ کو اور قرآن کے نام پر خلافِ قرآن افکار و نظریات کو پھیلانے کی مذموم کوششیں کی ہیں۔ اِن ہی کوششوں میں ایک کوشش وہ بھی ہے جو ہمارے دور میں مغربیت کی ذہنی غلامی اور اشتراکیت کی فکری اسیری میں مبتلا ہوکر چوہدری غلام احمد پرویز نے قرآنِ کریم کے نام پر دامِ ہم رنگ زمین بچھا کر کی ہے، اس کے نتیجہ میں مغربی معاشرت کے عادات و اطوار کو، اشتراکیت کے معاشی نظام کے ساتھ ملا کر اس قرآن کے نام پر پیش کیا ہے جس کے بغیر ہی ان سب اُمور کو عصر حاضر کی گمراہ قومیں پہلے سے اپنائے ہوئے تھیں۔

جناب غلام احمد پرویز تہذیبِ غالب کے یکے از خدامِ بے دام تھے یا زرخرید غلام تھے؟

www.KitaboSunnat.com

اسے ہم اللہ پر چھوڑتے ہیں جو عالم الغیب والشہادہ اور علیم بذات الصدور ہے۔لیکن یہ بات بہرحال واضح ہے کہ جو کام مغربی ممالک کے ملحد فلاسفہ اور بے دین دانشور، مسلم معاشروں میں براہِ راست خود نہیں کرسکتے تھے، وہ کام ہمارے 'مفکرِ قرآن'، 'قرآنی دانشور' بن کر کرتے رہے ہیں۔ان کی پچاس سالہ 'قرآنی خدمات' کا مغز اور خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ زبان اپنی استعمال کرتے تھے مگر بولی غیروں کی بولتے تھے۔ دماغ تو اُن کا اپنا تھا مگر اس میں فکر غیروں کی تھی۔ الفاظ تو وہ قرآن ہی کے استعمال کرتے تھے مگر ان کے پیکروں میں تصورات اشتراکیت اور مغربی معاشرت سے مستعار ومستورد تھے۔چنانچہ وہ اپنی جن 'قرآنی خدمات' پر گولڈن جوبلی منا کر سطحِ ارض سے بطن زمین میں منتقل ہوئے، ان پر یہودی علماء وپیشوا، نصرانی احبار ورہبان، الحاد ودہریت کے پُشتی بان، زندقہ وسیکولرزم کے علمبردار، سب خوش وخرم ہوکر ان کی تعریف وتحسین میں رطب اللسان ہوکر اُنہیں ہدیۂ تبریک اور گل ہائے تہنیت پیش کرتے ہیں۔ جب کہ عالم اسلام کے علماء بیک زبان ہوکر ان پر فتوائے کفر عائد کرتے ہیں۔

'مفکرِ قرآن' کی تعلّی آمیز انانیت

'مفکرِ قرآن' صاحب جس قدر قرآن، قرآن کی رٹ لگایا کرتے تھے، اُسی قدر وہ قرآن سے گریزاں اور کتاب اللہ سے کنارہ کش تھے۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ وہ اپنے مقابلے میں جملہ اہل علم کو قرآن سے بے خبر اور جاہل قرار دیا کرتے تھے۔ چنانچہ انانیت کے ساتویں آسمان پر محوِ پرواز رہتے ہوئے وہ بلا استثنا تمام علماے کرام کے متعلق یہ اعلان کیا کرتے تھے:

''حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات قرآن سے قطعاً نابلد ہوتے ہیں۔''

(طلوعِ اسلام: جون ۱۹۵۶ء ص ۶)

ایک اور مقام پر علما کے خلاف بڑا تحقیر آمیز رویہ اپناتے ہوئے، لیکن غرور وتکبر کی انتہائی بلندیوں پر براجمان ہوکر یہ فتویٰ داغتے ہیں:

''ہمارا مُلّا طلوعِ اسلام میں پیش کردہ دعوت کا جواب دلائل وبراہین سے تو دے نہیں سکتا (اس لئے کہ یہ دعوت قرآن کی دعوت ہے اور مُلّا بے چارہ قرآنی نور سے محروم ہوتا ہے۔)''

(طلوعِ اسلام: مئی ۱۹۵۳ء، ص ۴۷)

www.KitaboSunnat.com

ایک اور موقع پر اُسی اہانت آمیز لب ولہجہ میں جو علما کے خلاف ان کا مستقل وطیرہ تھا، یہ فرماتے ہیں:

''مُلّا کے پاس نہ علم ہوتا ہے، نہ بصیرت، نہ دلائل ہوتے ہیں، نہ براہین۔''

(طلوع اسلام: ۵ فروری ۱۹۵۵ء، ص۴)

اور مولانا مودودیؒ جن کی گھٹیا مخالفت میں 'مفکرِ قرآن' صاحب مرتے دم تک پرویزی حیلے اختیار کرتے رہے ہیں، یہ فتویٰ ان کے متعلق داغتے ہیں۔

ایک اور مقام پر مولانا مودودیؒ کے خلاف یہ فتویٰ بھی رسید کیا گیا ہے:

''ہم مودودی کو نہ دین کا عالم مانتے ہیں، نہ کوئی مفکر۔'' (طلوع اسلام: جون ۱۹۵۳ء، ص۶)

چنانچہ 'مفکرِ قرآن' صاحب اپنے عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں علماء کرام پر 'قدامت پرستی' کا لیبل لگا کر اپنے متعلق تعلّی آمیز خودستائی کا اظہار بایں الفاظ کیا کرتے تھے:

''جو کچھ میں قرآن سے پیش کرتا ہوں، اس کی تردید کے لئے چونکہ ہمارے قدامت پرست طبقہ کے پاس دلائل و براہین نہیں ہوتیں، اس لئے وہ خود بھی مشتعل ہوتا ہے اور عوام کو بھی مشتعل کرتا ہے۔'' (طلوعِ اسلام: اگست ۱۹۷۳ء، ص۳۶)

أعلم الناس بالقرآن کی پندار افزائی

'مفکرِ قرآن' صاحب خود أعلم الناس بالقرآن کے پندار میں مبتلا ہو کر یہی پندار اپنے نیاز مندوں میں بھی پیدا کیا کرتے تھے اور اُنہیں اس زعم میں مبتلا کیا کرتے تھے کہ تیرہ چودہ صدیوں بعد جو قرآنی آواز طلوعِ اسلام کے ذریعہ بلند ہو رہی ہے، آپ لوگ ہی اس کے واحد امین ہیں، باقی ساری دنیا اس آواز کا گلا گھونٹتی چلی آ رہی ہے۔

① تیرہ سو سال کے بعد پھر سے خالص قرآن کی آواز طلوعِ اسلام کی وساطت سے بلند ہونی شروع ہوئی ہے۔ (طلوعِ اسلام: نومبر ۱۹۵۳ء، ص۱۳)

② اس سرزمین سے تیرہ سو سال کے بعد پہلی بار قرآن کی آواز اُٹھی ہے اور قدرت کو یہ منظور ہے کہ تیرہ سو سال کے بعد ایک بار پھر قرآنی نظام اپنی عملی شکل میں سامنے آئے۔

(طلوعِ اسلام: نومبر ۱۹۵۴ء، ص۱۱)

www.KitaboSunnat.com

③ اس وقت ساری دنیا میں قرآنِ خالص کی آواز صرف آپ کی اس ننھی سی جماعت کی طرف سے بلند ہو رہی ہے۔ (طلوعِ اسلام: دسمبر ۱۹۶۴ء، ص ۸۷)

④ صدرِ اوّل کے بعد ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ قرآنی نظام کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ (طلوعِ اسلام: جون ۱۹۶۶ء، ص ۷۸)

⑤ پورے عالم اسلام میں ادارہ طلوعِ اسلام ہی وہ واحد ادارہ ہے جس نے چاروں طرف سے چھائی ہوئی مایوسیوں میں مسلمانوں کو پکارا اور بتایا کہ ان کی ذلت و رسوائی کا واحد سبب یہ ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی کتاب اور اس عطا فرمودہ روشنی سے دور جا پڑے ہیں۔ مسلمانوں کی باز آفرینی کے لئے یہی ایک صورت ہوسکتی ہے کہ جس طرح خدا کی دی ہوئی روشنی نے اس قوم کو آج سے چودہ سو سال پہلے ترقی اور عروج کے بامِ ثریا تک پہنچا دیا تھا۔ یہ قوم پھر اُسی مینارۂ نور سے کسبِ ضیا سے کرے اور اپنی زندگی کو اسی قالب میں ڈھال لے۔ ادارہ طلوع اسلام قریب تیس سال سے قرآن کریم کی آواز کو بلند کر رہا ہے۔

(طلوعِ اسلام: جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۷۳)

چنانچہ ایک مقام پر 'مفکرِ قرآن' اپنے منہ آپ میاں مٹھو بنتے ہوئے، اپنے حلقہ احباب کو یہ باور کرواتے ہیں کہ

۶۔ اس وقت ملک میں خالص فکری تحریک صرف آپ کی ہے، باقی سب وقتی ہنگامہ آرائیاں ہیں، جن میں اسلام کا نام لیا جاتا ہے، جیسے خطوں کی پیشانی پر ۷۸۶ لکھ دیا جاتا ہے، لیکن نفس مضمون سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ (طلوعِ اسلام: دسمبر ۱۹۶۷ء، ص ۵۲)

۷۔ اس وقت ساری دنیا میں صرف آپ کی یہ مختصر سی جماعت ہے، جو پیغام خداوندی کی مئے بے درد و صاف کو شفاف اور بے رنگ پیمانوں میں پیش کر رہی ہے۔

(طلوع اسلام، نومبر ۱۹۶۹ء، ص ۶۸)

ایک اور مقام پر خود نمائی اور خود ستائی کے ساتویں آسمان پر محوِ پرواز کرتے ہوئے 'مفکر قرآن' یوں تسلی آمیز انداز میں فرماتے ہیں:

''ہمارے ہاں، نہ کوئی ایسا صاحبِ فکر نکلا جو یہ سوچ سکے کہ قوم کی یہ حالت کیوں ہوگئی اور نہ

www.KitaboSunnat.com

کوئی ایسا صاحبِ عمل جو اس بے راہ ہجوم کا ہاتھ پکڑ کر اُسے راستہ پر لگا دے۔ سارے ملک میں لے دے کے، ایک طلوعِ اسلام کی آواز تھی (اور ہے) جو صحرا میں کھوئے ہوئے اس کارواں کے منتشر افراد کے لئے بانگِ دراتھی۔'' (طلوع اسلام: اکتوبر ۱۹۷۱ء، ص ۵۱)

چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے 'طلوعِ اسلام' نے بھی اپنے قارئین کو اس فریبِ یقین میں مبتلا کیا کہ ''آؤ لوگو! یہیں نورِ خدا پاؤ گے!''

''اس وقت ، ملک جن ہنگامی حالات سے دوچار ہے، ان میں قوم کو قرآنی راہنمائی کی اشد ضرورت ہے اور یہ راہنمائی اُسے طلوعِ اسلام کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل رہی ہے۔''

(طلوعِ اسلام: جنوری ۱۹۷۲ء، ص ۴۵)

راہنمائی قرآن کی یا تہذیبِ مغرب کی؟

حالانکہ جس چیز کو 'مفکرِ قرآن' اور طلوعِ اسلام، قرآنی راہنمائی قرار دیتے ہیں وہ قطعاً اور ہرگز ہرگز قرآنی راہنمائی نہیں ہے، بلکہ وہ صرف مارکسی اشتراکیت ہے جس پر قرآنی ٹھپہ لگا کر مغربی معاشرت کے عادات و اطوار کے ساتھ اُسی طرح ملا کر پیش کیا گیا ہے، جس طرح اکبر بادشاہ نے مذاہبِ شتّٰی کے بے جوڑ عناصر کو ملا کر 'دین الٰہی' بنا کر پیش کیا تھا۔

ایمان بالقرآن کے دعاوی پرویز

جہاں تک 'مفکرِ قرآن' کے ایمان بالقرآن کا تعلق ہے تو اس کی اصل حقیقت ذلك قولهم بأفواههم سے زیادہ نہیں ہے، وہ اگرچہ اپنے ایمان بالقرآن کا ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے اور قرآنِ کریم ہی کو واحد اتھارٹی اور سند قرار دیا کرتے تھے، لیکن عملاً اُن کے ہاں سند و معیار علماے مغرب کی تحقیقات ہی تھیں۔ نظریاتی اور قولی و قلمی حیثیت سے ایمان بالقرآن کی بابت اُن کے بلند بانگ دعاوی کی ایک جھلک مندرجہ ذیل اقتباسات میں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ صحت و سقم کا معیار میزانِ قرآنی ہے نہ میرا دعویٰ ، نہ غیر کی تردید۔ اس لئے اگر کوئی میری گذارشات کو باطل ٹھہراتا ہے تو اُسے کہو کہ اس کے لئے قرآن کی بارگاہ سے سند لائے۔

(طلوعِ اسلام: مئی ۱۹۵۲ء، ص ۴۸)

۲۔ ہمارے نزدیک دین کا معیار فقط کتاب اللہ ہے، خواہ اس کی تائید میں ہزار حدیثیں بھی

www.KitaboSunnat.com

ایسی کیوں نہ پیش کردی جائیں، جن کے راویوں میں جبرائیل و میکائیل تک کا بھی نام شامل کردیا گیا ہو۔ (طلوعِ اسلام: نومبر ۱۹۵۳ء، ص ۳۷)

۳۔ صحیح اور غلط کے پرکھنے کا ایک ہی معیار ہے یعنی یہ کہ اس کے متعلق قرآن کا کیا فیصلہ ہے۔ جیسے قرآن صحیح قرار دے، وہ صحیح ہے خواہ اُسے ایک آدمی بھی صحیح نہ مانتا ہو، اور جسے وہ غلط قرار دے، وہ غلط ہے خواہ اُسے ساری دنیا مسلمہ کی حیثیت سے جانتی ہو۔

(طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۵۴ء، ص ۲۵)

۴۔ قانون کے صحیح ہونے کی سند نہ زید ہے نہ بکر، نہ اسلاف ہیں نہ اخلاف۔ اس کی سند ہے اللہ کی کتاب جو اس کے مطابق ہے وہ صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ غلط ہے خواہ اسے کسی کی بدنیتی یا نادانی، کسی بڑی سے بڑی ہستی کی طرف بھی منسوب کیوں نہ کردے۔

(طلوعِ اسلام: مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۹)

۵۔ سوال یہ ہے کہ کسی چیز کے 'درحقیقت صحیح' ہونے کا معیار کیا ہے؟ قرآن کی رُو سے وہ معیار یہ ہے کہ جو بات کتابِ خداوندی کے مطابق ہو، وہ صحیح ہے اور جو اس کے خلاف ہو وہ غلط ہے۔ (طلوعِ اسلام: ستمبر ۱۹۵۹ء، ص ۶)

۶۔ کسی بات کے لئے اسلامی یا غیراسلامی ہونے کے لئے کسی انسان کی سند کافی نہیں ہوسکتی۔ اس کے لئے سند صرف خدا کی کتاب کی ہونی چاہئے۔

(طلوعِ اسلام: جنوری ۱۹۶۰ء، ص ۵۸)

۷۔ ہمارے پاس خدا کی کتاب موجود ہے، جس کی روشنی میں ہر انسان کو حق حاصل ہے کہ جو کچھ کسی اور انسان نے کہا ہے (خواہ وہ اس وقت موجود ہے یا ہم سے پہلے گزر چکا ہے) اسے پرکھے۔ اگر وہ اس کتاب کے مطابق ہے تو اسے صحیح تسلیم کرلیا جائے، اگر اس کے خلاف ہے تو مسترد کردیا جائے۔ (طلوعِ اسلام: جون ۱۹۶۷ء ص ۶۲)

۸۔ طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے، صحیح ہے۔ (طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۶۸ء، ص ۶۰)

۹۔ دین کے معاملہ میں حق و باطل اور صحیح و غلط کا معیار قرآنِ کریم ہے۔

(شاہکارِ رسالت، گذرگاہ خیال: ص ۳۹)

www.KitaboSunnat.com

۱۰۔ ہمارے سامنے ہدایت وضلالت کا معیار قرآنِ مجید ہے۔

(طلوعِ اسلام: جنوری ۱۹۵۹ء، ص ۳۱)

تِلـــــك عشـــــرة كاملــــــــة !!

'مفکرِ قرآن' کے وسیع لٹریچر میں سے مُشتے نمونہ از خروارے کے طور پر یہ وہ چند اقتباسات ہیں جن میں فقط قرآن ہی کے واحد معیار، اسی کے تنہا سند ہونے اور اسی کے پیمانۂ ردّ وقبول اور اسی کے کسوٹی ٔحق و باطل ہونے اور اسی کے فرقانِ صحت وسقم ہونے اور اسی کے میزانِ ہدایت و ضلالت ہونے کے خوش کن دعاوی مرقوم ہیں۔ ان 'خوش کن دعاوی' کی حیثیت دراصل کسی بد دیانت اور فریب کار تاجر کی دکان میں موجود اُن اصلی اور کھری چند اشیا کی سی ہے جنہیں وہ اپنے جعلی اور کھوٹے سروسامان کی بہتات میں مصلحتاً رکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ اعلانات 'مفکرِ قرآن' کے فی الواقع ہاتھی کے وہ دانت ہیں جو صرف دکھانے ہی کے کام آتے ہیں۔

دنیا میں ہر شخص اچھے سے اچھا خیال، بہتر سے بہتر نظریہ، خوب سے خوب تر فکر، مستحسن سے مستحسن تر فلسفہ ہر وقت پیش کرسکتا ہے، لیکن زمانے کا بے رحم صراف، ایسے کسی خیال، نظریے، فکر یا فلسفے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا جو عمل کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا۔ ہمارے 'مفکر قرآن' کے یہ سب خوش کن دعاوی اس وقت بے وقعت اور بے وزن ہوکر رہ جاتے ہیں جب وہ مسائل حیات کے حل کے لئے قرآنِ کریم کی بجائے مغربی تحقیقات کی طرف یہ کہتے ہوئے رجوع فرماتے ہیں کہ اُمتِ مسلمہ تو تقلیدی جمود کا شکار ہے جسے دیکھ کر اُن جیسے 'نابغہ عصر' اور 'مجتہدِ مطلق' کو بڑی کوفت ہوتی ہے اور پھر یہی کوفت ان الفاظ کا روپ دھار لیتی ہے:

''سلیم! تمہیں اپنا سینہ چیر کر درد وکرب کی ان تلاطم خیزیوں کو کس طرح دکھاؤں جنہوں نے مجھ پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے۔ سلیم!

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالہ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز

www.KitaboSunnat.com

تم نہیں دیکھ سکتے کہ میں پاکستان کے وسیع وعریض خطہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو عام طور پر یہ دیکھتا ہوں کہ

نہ کہیں لذتِ کردار، نہ افکارِ عمیق ☆

اور ایک ٹھنڈی سانس سے یہ کہہ کر خاموش ہوجاتا ہوں کہ

آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

('سلیم کے نام': ج ا/ص ۵۱)

اطاعتِ قرآن کی بجائے تقلیدِ مغرب

چنانچہ ہمارے 'مفکر قرآن' صاحب جو اُمتِ مسلمہ کو کیفیتِ جمود اور حالتِ تقلید میں دیکھ کر ٹھنڈی سانس سے یہ کہہ کر خاموش ہوجایا کرتے تھے کہ ''آہ! محکومی وتقلید و زوالِ تحقیق''، وہ تفسیر قرآن کی کوہ کنی میں ''اپنے دیدۂ تر کی بے خوابیوں کو''، ''اپنے پوشیدہ دل کی بے تابیوں'' کو، ''اپنے نالۂ نیم شب کے نیاز'' کو اور اپنی ''خلوت وانجمن کے گداز'' کو وقفِ راہِ تقلید مغرب کئے ہوئے تھے۔ کیونکہ مغرب میں 'زوالِ تحقیق' کی بجائے 'عروجِ تقلید' موجود ہے۔ وہ قرآنی حقائق کی بجائے، تحقیقاتِ مغرب کو حتمی، قطعی اور یقینی قرار دیا کرتے تھے۔ وہ 'ابہاماتِ قرآن' کو تہذیبِ غالب کے انکشافات واکتشافات کی روشنی میں کھولا کرتے تھے، جہاں کہیں وہ قرآنی حقائق اور مغربی تحقیقات میں ٹکراؤ ہوتا تھا، وہ وہاں تحقیقاتِ مغرب کو شرفِ تقدم عطا کرکے قرآنِ کریم کو اُن کے مطابق ڈھال دینے پر جت جایا کرتے تھے تاکہ خدا کی کتاب 'جدید تقاضوں سے ہم آہنگ' ہوجائے اور کوئی نہ کہہ سکے کہ از منۂ مظلمہ میں نازل ہونے والی یہ کتاب آج کے 'روشن دور' کی 'علم وبصیرت' کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتی۔

اس امر کے اثبات میں اگرچہ متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن مقالے کی تنگ دامنی کے باعث چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے:

پہلی مثال: انسانوں میں تصورِ خدا کیسے پیدا ہوا؟

بنی نوع انسان میں خدا کا تصور، عقیدۂ اُلوہیت اور ایمان باللہ کا نظریہ کیسے پیدا ہوا؟

☆ خود پرویز صاحب جس 'لذتِ کردار' کے مالک تھے، اُسے جاننے کے لئے میری کتاب ''جناب غلام احمد پرویز: اپنے الفاظ کے آئینے میں'' کا مطالعہ فرمائیے اور اُن کے 'افکارِ عمیق' سے واقفیت پانے کے لئے میری جملہ کتب اور بالخصوص 'تفسیر مطالب الفرقان کا علمی اور تحقیقی جائزہ' کا مطالعہ فرمائیے۔

www.KitaboSunnat.com

اس سوال کا واضح اور اطمینان بخش جواب از روے قرآن یہ ہے کہ ایسا وحیٔ خداوندی کی بنا پر ہوا۔ لیکن ہمارے 'مفکرِ قرآن' کی عقل و دانش اور 'قرآنی بصیرت' اس کا کوئی اور ہی جواب فراہم کرتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے یہ جواب:

''جب انسانی شعور نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو عجیب دنیا میں پایا۔ سر پر آتش باری کرنے والا ایک عظیم اور مہیب گولہ، چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ، ادھر اُدھر ساحل نا آشنا سمندر اور اس کی خوفناک تلاطم انگیزیاں، یہاں وہاں کف بردہاں اور سیلاب درآغوش دریاؤں کی خوف سامانیاں، میلوں تک ڈراؤنے جنگل اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور اژدہے، کبھی بادل کی لرزہ خیز گرج، کبھی زلزلوں کی تباہ کاریوں کا ہجوم، شش جہات میں اس قسم کی خوفناک بلاؤں کا ہجوم و اژدہام اور ان کے اندر گھرا ہوا بے یارو مددگار اور بے سروسامان تنہا ابن آدم۔ آپ سوچئے کہ ان حالات میں خارجی کائنات کے متعلق اس کا ردّعمل اس کے سوا کیا ہوسکتا تھا کہ جو بلا سامنے آئے، یہ گڑگڑانا شروع کردے۔ جہاں کوئی خطرہ آنکھ دکھائے یہ اس کے سامنے سرنگوں ہوجائے۔ اس طرح فطرت کی مختلف قوتیں اس کا 'اِلٰہ' اور یہ اس کا پرستار بن گیا۔ چاند، سورج، ستارے، گرج، کڑک، بارش، آندھی، آگ، دریا، سانپ، شیر، حتیٰ کہ وبائی امراض، سب دیوی دیوتا تصور کرلئے گئے اور ان کی بارگاہ میں نذونیاز، منت وسماجت اور مدح وستائش سے اُنہیں خوش رکھنے اور راضی رکھنے کی تدابیر اختیار کی جانے لگیں۔ یہ تھا (اُس ماحول میں) انسان کا اوّلین ردّعمل۔ خارجی کائنات کے متعلق رفتہ رفتہ اسی ردّعمل نے مذہب کی شکل اختیار کرلی اور آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی عقیدہ یا تصور مذہب کی شکل اختیار کرلے تو حالات کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں اس میں تبدیلی نہیں آیا کرتی، چنانچہ دنیا کے بیشتر مذاہب کائنات کے متعلق انسان کے اس اوّلین ردّعمل کے مظاہر ہیں۔'' ('اسلام کیا ہے؟' ص۱۹۴)

'مفکرِ قرآن' کا قطعی خلافِ قرآن فلسفہ

'مفکرِ قرآن' کا یہ اقتباس اس امر کو واضح کردیتا ہے کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا عقیدہ توحید سے نہیں بلکہ نظریۂ شرک سے کی تھی۔ یہ نظریہ دراصل دین بیزار، اسلام دشمن، توحید مخالف اور دہریت پسند قوموں کا فلسفہ ہے جسے اُنہوں نے 'خدا سے بیزار عقل' کی کسوٹی پر پرکھ

www.KitaboSunnat.com

کر پیش کیا ہے اور ہمارے 'مفکرِ قرآن' نے اپنی فکری اسیری اور ذہنی غلامی کی بنا پر اسے من وعن قبول کرلیا ہے حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے سفر حیات کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں عقیدۂ توحید کی روشنی میں کی تھی نہ کہ کفر وشرک کی ظلمت میں۔ انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس کی رہنمائی کرنا خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے جیسا کہ قرآنِ کریم میں بکثرت مقامات پر خدائے قدوس کی اس ذمہ داری کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً:

﴿وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ ﴾ (النحل:۹)

''اور راہِ راست دکھانا اللہ ہی کے ذمہ ہے جب کہ ٹیڑھے راستے میں موجود ہیں۔''

﴿إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ﴾ (اللیل:۱۲)

''اور ہم پر ہی یہ لازم ہے کہ ہم رہنمائی کریں۔''

اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا انسان جو پیدا کیا تو اسے علم وحی سے نوازا۔ مرتبۂ نبوت عطا فرمایا تاکہ وہ علم کی روشنی میں، نہ کہ جہالت و بے خبری کی تاریکی میں، اپنے سفر حیات کا آغاز کرے۔

تنقید بر 'دلائل پرویز'

اپنے 'مفکرِ قرآن' کے وہ دلائل جو اُنہوں نے 'خارجی کائنات' کے متعلق انسان کے اوّلین ردّعمل کے ضمن میں پیش کئے ہیں تو وہ دراصل 'دلائل' نہیں بلکہ دانشورانِ مغرب کی چچوری ہوئی وہ ہڈیاں ہیں جنہیں منکرین حدیث اپنے منہ سے اُگل رہے ہیں اور حیرت بالائے حیرت یہ امر ہے کہ تہذیبِ مغرب کے سحر میں گرفتار یہ غلام فطرت لوگ اپنی اسلامی حس اور تنقیدی قوت کو سرے سے ہی کھو چکے ہیں یہاں تک کہ مغرب سے جو کچھ بھی آتا ہے، اُسے وحی سمجھ کر من وعن قبول کرلیا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال اسی زیر بحث معاملہ میں دیکھی جاسکتی ہے کہ انسانی دنیا میں خدا اور مذہب کے تصور کی پیدائش میں کس طرح فلاسفۂ مغرب کی اندھی تقلید کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کو محض خوف کی 'پیداوار' قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ کاروانِ انسانیت کے سفر کا آغاز علم وحی کی روشنی میں نہیں بلکہ جہل و بے علمی کی تاریکی میں ہوا تھا اور نہیں معلوم کہ سفر ارتقا کی کتنی منزلیں طے کر ڈالنے کے بعد اور مدتِ دراز کی کشتی ٹھوکریں کھانے کے بعد اس

www.KitaboSunnat.com

کارواں کو توحید و اسلام کی روشنی دکھائی دی۔ یہ سب کچھ دراصل اسلامی فلسفۂ تاریخ سے قطعی جہالت و ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور ساتھ ہی فلسفۂ مغرب سے شدید فکری مغلوبیت اور ذہنی مرعوبیت کا بھی۔ بیدار مغز مسلم مفکرین نے جنہیں تہذیبِ مغرب کی چمک دمک متاثر نہ کرسکی، اپنی جاندار تنقید سے مغربی فلسفہ کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے درج ذیل اقتباس.....مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ بات کہ مذہب کا آغاز اَن دیکھی قوتوں کے خوف سے ہوا ہے اور یہی جذبہ انسان کے جذبات میں اوّلین اور قدیم جذبہ ہے، بالکل بے سروپا ہے۔انسانوں میں جو خوف پایا جاتا ہے اس کی اصل حقیقت، زوالِ نعمت کا اندیشہ ہے۔خود کا تجزیہ کیجئے تو صاف نظر آئے گا کہ خوف نام ہے اس چیز کا کہ آپ کو کسی ایسی چیز کے چھن جانے یا اُس سے محروم ہوجانے کا اندیشہ یا خطرہ پیدا ہوگیا ہے جو آپ کو حاصل بھی ہے اور عزیز بھی۔مثلاً انسان کو اپنی زندگی عزیز ہے، زندگی کا سروسامان عزیز ہے، اپنے بیوی بچے عزیز ہیں۔اس لئے وہ ان چیزوں کی طرف سے اندیشہ میں ہوتا ہے کہ کہیں یہ چیزیں چھن نہ جائیں۔دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر خوف سے پہلے کسی نعمت کا شعور بھی لازمی ہو اور پھر اس کی شکرگزاری کا جذبہ پیدا ہونا بھی ناگزیر ہوا۔

اس نظریہ کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جو چیزیں انسان کے اندر خوف کی حالت پیدا کرتی ہیں، وہ دنیا کے عام واقعات میں سے نہیں۔زلزلے روز نہیں آیا کرتے، آتش فشاں پہاڑ روز نہیں پھٹتے، بجلیاں روز نہیں کڑکتیں، وبائیں روز نہیں پھوٹتیں اور طوفان کا شور بھی کوئی روزمرہ کا واقعہ نہیں۔اس کے برعکس تارے روز چمکتے ہیں، سورج روز چمکتا ہے، چاند روز چمکتا ہے اور اپنی روپہلی چاندنی کی چادر روز دشت و جبل میں بچھاتا ہے۔آسمان کی نیلگونی ہر لمحہ باصرہ نوازی کرتی ہے۔ابرِ کرم کی تر دستیاں اور درختوں کی ثمر باریاں ہر موسم میں موجود رہتی ہیں۔پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مظاہر فطرت کی گاہ گاہ کی گھرکیاں اور دھمکیاں تو انسان کو اس درجہ مرعوب کردیں کہ وہ ان کی پوجا کرنے لگ جائے، لیکن منعم غیب کی ساری فیاضیاں بالکل بے اثر ہوکر رہ جائیں اور انسان میں شکر و سپاس کا کوئی ولولہ پیدا نہ کریں۔اس لئے انسان کے مشاہدۂ کائنات اور مشاہدۂ النفس کی فطری راہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ نعمتوں اور رحمتوں کے

www.KitaboSunnat.com

مشاہدہ سے اس پر ایک منعم حقیقی کی شکرگزاری کا جذبہ اور احساس طاری ہوا اور پھر اس جذبہ کی تحریک سے وہ اُس کی بندگی کی طرف مائل ہوا، گویا دین کا آغاز توحید سے ہوا، اس میں کجی پیدا کرکے شرک کی راہ انسان نے بعد میں اختیار کی۔'' (فلسفے کے بنیادی مسائل: ص ۳۵)

ہمارے 'مفکر قرآن' چونکہ ذہناً اور کلیاً فلسفہ سے مرعوب و مسحور تھے۔ اس لئے وہ مقہور و مجبور تھے کہ اس سوال کے جواب میں کہ بنی نوع انسان میں خدا کا تصور کیسے پیدا ہوا؟ وہی فلسفہ اپنائیں جس کی روشنی میں اہل مغرب کے ہاں انسان کا سفر حیات (توحید کی روشنی میں نہیں بلکہ) شرک و کفر کی تاریکیوں میں ہوا تھا اور پھر اسی فلسفۂ باطلہ کی لاج رکھتے ہوئے، اُنہوں نے اپنی فکری مرعوبیت اور ذہنی غلامی کا کھلا کھلا ثبوت فراہم کر ڈالا ہے۔ یہ طرزِ عمل خود اس حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے کہ 'مفکرِ قرآن' کس طرح قرآن کا نام لے کر، فکرِ فرنگ اور فلسفۂ مغرب کی پیروی کیا کرتے تھے۔

عمر بھر کے مطالعۂ قرآن کے بعد بھی قرآن سے بے خبری

'مفکرِ قرآن' اپنی ستائش آپ کرتے ہوئے اکثر اپنی عمر بھر کی قرآنی تحقیق و ریسرچ کا ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے، مثلاً

''میں، اے برادرانِ گرامی قدر! قرآنِ کریم کا طالب علم ہوں، میں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس کتابِ عظیم کی روشنی میں اپنی بصیرت کے مطابق اسلام کے بنیادی تصورات کا مفہوم متعین کرنے میں صرف کیا ہے اور میری اس کوشش کا ماحصل، میری تصانیف کے اَوراق میں محفوظ ہے۔'' (طلوعِ اسلام: جنوری ۱۹۷۳ء، ص ۲۷)

''مہ و سال کے شمار سے میں ۹ جولائی ۱۹۷۸ء کو اپنی عمر رواں کے پچھتّر سال پورے کر رہا ہوں۔ یہ کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں تھا جس کا خصوصیت کے ساتھ طلوعِ اسلام کے صفحات میں ذکر کیا جاتا۔ قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی موجودہ قرآنی فکر اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں پچاس سال پورے کر رہا ہوں۔ عام اصطلاح میں اسے 'گولڈن جوبلی' کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ پچاس سالہ 'جوبلی' دنیا کے ہر متاع سے زیادہ گراں مہا اور اس کی یاد، سب سے زیادہ وجہِ نشاطِ روح ہے اور نشاط و انبساط کے یہی وہ احساسات ہیں جن میں اپنے بے شمار دیدہ و نادیدہ اَحباب و رفقا اور متفقین کو شریک کرنے کے لئے میں نے اس

www.KitaboSunnat.com

کا تذکرہ ضروری سمجھا ہے۔ میں جب ساحلِ عمر کے ریگِ رواں پر ان پچاس سالہ نقوش کو مرتسم دیکھتا ہوں تو حیرت میں جو متن اپنے سامنے رکھا تھا، اس میں مجھے اس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس سے میرا سرِنیاز اس بارگاہِ عتبۂ عالیہ پر بے ساختہ جھک جاتا ہے جس کی عطا کردہ راہنمائی کے بغیر اس کامیابی کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہوسکتا تھا اور حیرت یہ کہ تمام دنیاوی علائق کے باوجود (جن میں کم وبیش تیس سال ملازمت کے بھی شامل ہیں) میں نے انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں تن تنہا یہ طویل مسافت کیسے طے کرلی۔''

(طلوعِ اسلام: جولائی ۱۹۷۸ء، ص۶)

بلاشبہ 'مفکرِ قرآن' نے قرآنی مطالعہ وتحقیق میں پچاس سال صرف کرڈالے، لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ وہ لغت ہائے حجازی کے قارون تو بن گئے، لیکن قرآن کی روح اُن پر بے نقاب نہ ہوسکی، کیوں؟ صرف اس لئے کہ ان کی آنکھوں پر ایک مخصوص رنگ کی عینک چڑھی ہوئی تھی، اور دورانِ مطالعہ انہیں ہر چیز اُسی عینک ہی کے رنگ میں دکھائی دیتی رہی اور قرآنِ کریم کی وہ واضح آیات جو فکرِ مغرب کی تردید کرتے ہوئے یہ اعلان کرتی ہیں کہ کاروانِ انسانیت نے اپنا سفر، کفر وشرک اور جہالت و بے علمی کی تاریکیوں میں نہیں بلکہ عقیدۂ توحید اور علم وحی کی روشنی میں شروع کیا تھا، اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہی رہیں۔ صرف دو آیات ملاحظہ فرمائیے:

﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا﴾ (یونس:۱۹)

''اور لوگ تو ایک ہی اُمت تھے پھر اُنہوں نے اختلاف کیا۔''

﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾

''(ابتدا میں) سب کچھ لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔ (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو مبشر اور منذر تھے۔'' (البقرۃ:۲۱۳)

یہ دونوں آیات فکرِ پرویز کی تردید کرتی ہیں جو اُنہوں نے 'مفکرِ قرآن' کی حیثیت سے مغرب سے اپنی ذہنی مرعوبیت کے باعث اپنا رکھا تھا۔ پہلی آیت کے تحت مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''ضمناً اس سے جدید فلسفیوں کے اس نظریہ کی بھی تردید ہوگئی کہ انسان نے دین کا آغاز شرک سے کیا، پھر درجہ بدرجہ اِرتقا کرتے ہوئے توحید تک پہنچا۔ قرآن اس کے برعکس یہ کہتا ہے کہ خدا نے شروع ہی سے انسان کو توحید کی تعلیم دی، لیکن گمراہوں نے اس میں اختلاف پیدا

www.KitaboSunnat.com

کرکے فتنے کھڑے کردیئے۔ہم نے فلسفۂ جدید کے اس باطل نظریہ کی تردید اپنی کتاب 'حقیقتِ توحید' میں تفصیل سے کی ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد۴ص ۳۵)

اور دوسری آیت کے تحت مولانا عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں:

''آیت نے ایک بڑی گرہ کھول دی۔فرنگی 'محققین' حسبِ معمول مدتوں اس باب میں بھٹکتے رہے اور ان میں اکثر یہی کہے گئے کہ انسان کا ابتدائی مذہب شرک یا تعددِ آلہہ تھا۔شروع شروع میں وہ ایک ایک چیز کو خدا سمجھتا تھا اور عقیدۂ توحید تک نسلی انسانی بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد اور عقلی اور دماغی ارتقا کے بڑے طویل سفر کے بعد پہنچی ہے۔قرآنِ مجید نے اس خرافی نظریہ کو ٹھکرا کر صاف اعلان کردیا کہ نسلِ انسانی آغازِ فطرت میں دینی حیثیت سے ایک اور واحد تھی۔ اس میں 'مذہب' و 'اَدیان' کے یہ تفرقے کچھ بھی نہ تھے۔امتِ واحدہ میں جس وحدت کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ اس سے دینی واعتقادی وحدت ہی مراد ہے:

كانوا على شريعة من الحق (ابن جریر،عن ابن عباس)

إنهم كانوا على دين واحد وهو الإيمان والحق هذا قول أكثر المحققين (تفسیر کبیر)

صدیوں کی اُلٹ پھیر اور قیل وقال کے بعد اب آخری فیصلہ بڑے بڑے ماہرین اثریات، انسانیات و اجتماعیات (سرچارلس مارسٹن، پروفیسر لنگڈن اور پروفیسر شمڈٹ) کا یہی ہے کہ انسان کا اوّلین دین، دینِ توحید تھا۔'' (تفسیر ماجدی: صفحہ۸۳، حاشیہ۷۷۲)

'مفکرِ قرآن' کی اندھی تقلیدِ مغرب

لیجئے، اب تو مغربی مفکرین بھی اپنی تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ انسان کا اوّلین دین، دینِ توحید تھا۔لیکن ہمارے 'مفکرِ قرآن' ماڈرن ہوکر بھی ابھی تک اس مسئلہ میں 'قدامت پرستی' پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ دراصل 'مفکرِ قرآن' صاحب یہاں کے اس جدید طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن کے ذہنوں پر مغرب کی اندھی پیروی کے باعث ایسا جمود وتعطل طاری ہوگیا ہے کہ اگر وہاں سے کوئی غلط بات بھی صادر ہوجائے تو اُسے 'وحی' قرار دے کر ہاتھوں ہاتھ لے لیا جاتا ہے اور مسائلِ حیات کے حل کے لئے پوری مقلدانہ سعادت مندی کے ساتھ اُن ہی نسخوں کو آزماڈالا جاتا ہے جو دراصل یہاں کے لئے بنائے ہی نہیں گئے تھے۔

www.KitaboSunnat.com

اہل مغرب دورِ حاضر کی غالب تہذیب کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے اپنے مجوزہ نسخوں کو مجتہدانہ بصیرت سے برتتے ہیں اور حسبِ ضرورت ان میں ترمیم بھی کر لیتے ہیں، لیکن یہاں کے مقلد تو ایسے کور چشم واقع ہوئے ہیں کہ اپنے وطن، ماحول، حالات، الغرض ہر چیز سے آنکھیں بند کرتے ہوئے مریض کی آخری ہچکی تک وہی نسخہ استعمال کرتے رہیں گے، اِلا یہ کہ خود وہیں سے ترمیم کی کوئی اطلاع آجائے۔ لیکن بعض ضدی قسم کے عطائیوں کا تو یہ حال ہے کہ جس غلط بات کو ایک مرتبہ تقلیدِ یورپ میں اختیار کرلیا ہو، اُسے پھر دانتوں سے پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بعدازاں اب اگر وہاں کے مفکرین کی تحقیقات میں بھی وہ غلط قرار دی گئی ہو تو بھی یہاں کے مقلدین اس کی تردید وتکذیب پر آمادہ نہیں ہوتے۔ فما کانوا لیؤمنوا بما کذبوا من قبل !

اب یہاں دیکھئے، مفکرینِ مغرب مثلاً سرچارلس مارسٹن، پروفیسر لنگڈن اور پروفیسر شمڈٹ وغیرہ اپنی جدید تحقیقات کے باعث سابقہ نظریہ کو ترک کرکے اس تحقیق وانکشاف پر متفق ہو رہے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کا آغاز کفر وشرک کی ظلمتوں اور جہالت و بے خبری کی تاریکیوں میں نہیں کیا بلکہ عقیدۂ توحید اور علم وحی کی روشنی میں کیا تھا، لیکن ہمارے ہاں تجدد پسند دانشور ابھی تک مغرب کی پرانی تحقیق پر جمے ہوئے ہیں جو صریحاً خلافِ قرآن ہے۔

دوسری مثال: انکارِ نبوتِ آدم:

ملتِ اسلامیہ کا چودہ صدیوں پر محیط لٹریچر اس حقیقت پر شاہد ہے کہ ہر دور کے مفکرین و مجتہدین، مفسرین ومحدثین، علماء وفقہا، مؤرخین و اصحابِ سیر نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا ایک برگزیدہ پیغمبر اور نبی تسلیم کیا ہے، لیکن ہمارے 'مفکرِ قرآن' اُنہیں نبی تسلیم نہیں کرتے اور اس کے لئے بایں الفاظ دلیل پیش کرتے ہیں:

''سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قصۂ آدم میں کہا گیا ہے کہ خدا نے آدم کو بالتصریح ایک حکم دیا اور آدم نے اس سے معصیت برتی، اس قسم کی معصیت کسی نبی کا شیوہ نہیں ہوسکتا..... حضرات انبیا تو رہے ایک طرف، جیسا کہ بتایا جاچکا ہے، ابلیس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے کہ ﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ﴾ (۱۵/۴۲) ''یقیناً میرے بندوں پر تجھے

www.KitaboSunnat.com

غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔'' (تفسیر مطالب الفرقان: ج۲/ص۶۳)

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں:

اوّلاً یہ کہ..... آدم علیہ السلام کی یہ معصیت تھی کس قسم کی؟ جس کے متعلق خود پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ ''اس قسم کی معصیت، کسی نبی کا شیوہ نہیں ہوسکتی۔''

حقیقت یہ ہے کہ آدم علیہ السلام، نہ تو معصیت کوش تھے اور نہ ہی نافرمانی ربّ کا وہ کوئی ارادہ رکھتے تھے۔ بات صرف یہ ہوئی کہ بقول پرویز صاحب:

''﴿وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِينَ﴾ ''شیطان نے قسمیں کھا کر کہا: جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اس میں میرا کوئی فائدہ نہیں۔ میں یہ سب کچھ تمہاری خیرخواہی کے لئے کر رہا ہوں۔'' (مفہوم القرآن: آیت ۲۱/۷)

اور حضرت آدم علیہ السلام جن کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ کوئی فرد اللہ کے نام کی قسم کھا کر کسی کو دھوکہ دے سکتا ہے، اپنی فطری سادگی کی بنا پر اس شیطانی چکمہ کا شکار ہوگئے، پھر یہ دھوکہ دہی کی واردات بھی پہلی ہی تھی کہ اس سے قبل اُنہیں کبھی کسی فریب دہی اور دھوکہ بازی کی صورتِ حال کا سامنا نہ ہوا تھا، بلکہ اس وقت تک آدم علیہ السلام اپنی فطرت کی سادگی اور پاکیزگی پر قائم تھے کہ جھوٹ، دھوکہ اور فریب جیسے رذائل سے ان کا تعارف ہی نہ ہوا تھا۔ اس لئے وہ شیطان کے فریب میں آگئے پھر کیا حضرات انبیا، عالم الغیب ہوتے ہیں کہ کسی بدباطن کے دھوکہ میں نہ آئیں؟ کیا یہ واقعی اس قسم کی معصیت تھی جس سے انبیاے کرام بالاتر ہوا کرتے ہیں؟ آخر وہ کسوٹی اور معیار تو بیان کیا جاتا جس کی رو سے انبیا کی معصیت اور غیر انبیا کی معصیت میں فرق کیا جاسکے۔

لغزشِ یونس اور پرویز

پھر از روے قرآن حضرت یونس علیہ السلام سے جو کچھ سرزد ہوا، کیا وہ آدم علیہ السلام کی لغزش سے بڑی لغزش نہ تھی، حالانکہ نبوتِ یونسؑ کے خود پرویز صاحب بھی قائل ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق خود پرویز صاحب لکھتے ہیں:

''..... وہ قوم کی مخالفت سے سخت گھبرا گیا اور پیشتر اس کے کہ اسے خدا کی طرف سے ہجرت

www.KitaboSunnat.com

کرنے کا حکم ملتا، وہ اپنے فرائض منصبی کو چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہوگیا.....''

(برقِ طور: ص ۲۸۹)

پھر ایک اور مقام پر حضرت یونس علیہ السلام کی لغزش کی وضاحت بایں الفاظ کرتے ہیں:

''خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم، اُس وقت ملا کرتا ہے جب اس قوم کا حق وصداقت کو قبول کرنے کا امکان باقی نہ رہے۔ اس سے پہلے وہاں سے چلے جانا گویا اپنے فرائضِ منصبی کو چھوڑ دینا ہے۔ یہی یونس علیہ السلام کی اجتہادی غلطی تھی۔'' (برقِ طور: ص ۲۸۹، ۲۹۰)

اب غور فرمایئے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے جو کچھ سرزد ہوا وہ ان کی اپنی طرف سے بغیر کسی 'ناصح' کی پھسلاہٹ کے واقع ہوا، اور اُنہوں نے بطن ماہی میں لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کہہ کر اعترافِ لغزش بھی کیا اور معافی بھی مانگی۔

دوسری طرف، حضرت آدم علیہ السلام سے جو کچھ واقع ہوا، وہ ان کی آزادانہ مرضی کا نتیجہ نہ تھا۔ ابلیس کے اس فریب کا نتیجہ تھا جو اس نے ناصح و شفیق کا روپ دھار کر خدا کی قسمیں کھا کر دیا تھا۔ اگر ابلیس اُنہیں یہ چکمہ نہ دیتا تو ان سے یہ امر سرزد ہی نہ ہوتا۔ بخلاف ازیں حضرت یونس علیہ السلام سے جو کچھ وقوع پذیر ہوا، اس میں ابلیس یا کسی اور 'شفیق ناصح' کا عمل دخل تھا ہی نہیں، لیکن ہمارے 'مفکرِ قرآن' حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''اس قسم کی معصیت کسی نبی کا شیوہ نہیں ہوسکتا'' یعنی کسی کی قسموں پر اعتبار کر کے اسے شفیق ناصح جان کر اگر کسی سے لغزش ہوجائے تو یہ تو نبی کا شیوہ نہیں ہوسکتا، لیکن اگر کسی نبی سے ایسے حکم خدا کی نافرمانی ہوجائے جو سب انبیا کے لئے ہجرت کے لئے ایک مستقل ضابطہ کی حیثیت رکھتا ہے تو ایسی نافرمانی ''نبی کا شیوہ ہوسکتی ہے۔'' قربان جایئے 'مفکر قرآن' کی اس 'قرانی فہم وبصیرت' کے!

ثانیاً یہ کہ..... پرویز صاحب کا یہ استدلال کہ..... ''شیطان نے آدم پر غلبہ پالیا جبکہ نبی تو رہا ایک طرف وہ اللہ کے مخلص بندوں پر بھی حاوی نہیں ہوسکتا'' از حد لغو استدلال ہے، جو 'مفکرِ قرآن' کے غلبۂ شیطان کی حقیقت سے بے بہرہ ہونے کا نتیجہ ہے۔

www.KitaboSunnat.com

غلبۂ شیطان یا مسِ شیطان؟

غلبۂ شیطان کا اصل مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے جملہ اُمور میں نہیں تو اکثر و بیشتر معاملات میں شیطان کا پیرو بن جائے اور شیطان کو اس پر اس قدر قابو حاصل ہوجائے کہ وہ راہِ راست پر نہ رہنے پائے، رہا کسی ایک آدھ معاملے میں، شیطانی وسوسہ یا ابلیسی نسیان کا شکار ہوجانا، تو اسے غلبۂ شیطان سے تعبیر کرنا سوئے تعبیر ہے۔ اسے بیش از بیش 'مسّ شیطان' کہا جاسکتا ہے، چنانچہ قرآن مجید خود 'غلبۂ شیطان' اور 'مسِ شیطان' میں فرق کرتا ہے۔ وہ اوّل الذکر کے متعلق یہ کہتا ہے کہ إِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲) ''یقیناً میرے بندوں پر تجھے غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔'' اور 'مس شیطان' کے بارے میں خود قرآنِ کریم ہی میں یہ مذکور ہے کہ اہل تقویٰ حضرات بھی بعض اوقات اس سے محفوظ نہیں رہ پاتے، تاہم خدا کی یاد جب اُن کی آنکھیں کھول دیتی ہے تو ان کی خفیہ یا مدھم بصیرت میں بیداری یا جلا پیدا ہوجاتی ہے اور وہ 'مس شیطان' کے اثر سے چھٹکارا پا لیتے ہیں۔ قرآن مجید اس سلسلہ میں یہ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ (الاعراف:۲۰۱)

''بے شک جو لوگ تقوی شعار ہیں انہیں جب شیطان کی طرف سے وسوسہ پہنچتا ہے اللہ کو یاد کرتے ہیں تو ان کو آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

جو لوگ 'غلبۂ شیطان' اور 'مسِ شیطان' میں فرق و امتیاز کی تفصیلی وضاحت چاہتے ہیں، اُنہیں چاہئے کہ وہ میری کتاب 'تفسیر مطالب الفرقان کا علمی اور تحقیقی جائزہ' کا مطالعہ فرمائیں۔ اس میں اثباتِ نبوتِ آدم کا تفصیلی تذکرہ بھی موجود ہے۔

انکارِ نبوت آدم علیہ السلام کی اصل وجہ؟

حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت کے انکار کی اصل وجہ دراصل وہ فلسفہ تاریخ ہے جسے مغرب نے پیش کیا ہے اور پرویز صاحب اُسے دل و جان قبول کر چکے ہیں۔ نبوتِ آدم کا اقرار و اعتراف اس فلسفۂ تاریخ سے میل نہیں کھاتا جبکہ اسلامی فلسفۂ تاریخ کی رو سے آدمؑ کی نبوت کو قبول کئے بغیر چارۂ کار نہیں، کیونکہ روئے زمین پر اوّلین انسان کے ظہور پذیر ہونے

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلسلۂ رشد و ہدایت کا اجرا و آغاز، رحمتِ خداوندی کا ویسا ہی ناگزیر تقاضا ہے جیسا انسان کی مادی ضروریات کو پورا کرنا۔

قرآن کریم کی رُو سے تخلیقِ بشر (آدمؑ) کا مقصد ہی زمین میں خلافت کے فرائض کو انجام دینا ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اللہ کی مرضی اور ہدایت پر چلے۔ اگر وہ خدائی رہنمائی سے انحراف کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ خلافت کی بجائے بغاوت کی راہ اختیار کرتا ہے بلکہ وہ مستحق سزا بھی ٹھہرتا ہے اور یہ سزا دنیا میں ضیقِ قلب اور آخرت میں دخولِ جہنم کی صورت میں ہوگی، لیکن اگر وہ اپنے فرائض مرضاتِ الٰہیہ کے تابع انجام دیتا ہے تو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی انعامِ خداوندی کا مستحق قرار پاتا ہے۔ آدمؑ کو زمین پر اُتارتے وقت یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دی تھیں:

﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ﴾

(طٰہٰ: ۱۲۳، ۱۲۴)

''اب اگر میری طرف سے تمہیں ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ نہ بھٹکے گا، نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا، تو اس کے لئے دنیا میں بھی تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز بھی ہم اسے اندھا کر کے اُٹھائیں گے۔''

چنانچہ آدمؑ جو ابوالبشر اور اولی الانسان تھے، اُسے امورِ خلافت کی انجام دہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے نورِ ہدایت سے نوازا اور مقامِ نبوت پر سرفراز فرمایا۔ اس طرح انسانی معاشرہ کی ابتدا کفر و شرک او رالحاد و دہریت کی تاریکیوں میں ہونے کی بجائے توحید و رسالت اور رشد و ہدایت کی روشنی میں ہوئی۔ لیکن 'مفکرِ قرآن' کے قلب و ذہن اور حواس و مشاعر پر جو فلسفہ اپنی مضبوط گرفت قائم کر چکا ہے، اس کی رُو سے انسانی معاشرہ کی ابتدا، کفر و شرک یا الحاد و دہریت سے ہوئی تھی اور پھر رفتہ رفتہ یہ معاشرہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا توحید تک پہنچا۔ اس طرح بہت بعد میں کہیں جا کر سلسلۂ وحی و رسالت آغاز پذیر ہوا۔ ابتدائی انسانی معاشرہ کے متعلق پرویز صاحب فرماتے ہیں:

www.KitaboSunnat.com

''قوموں کے عروج و زوال میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ خارجی کائنات اور Outer Space کے بارے میں ان کا نظریہ کیا ہے؟ انسان کے شعور نے جب پہلے پہلے آنکھ کھولی تو فضا اور ماحول اس کے خلاف تھا، سر پر آگ برسانے والا شعلہ، آندھیاں، جھکڑ، بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج، بپھرے ہوئے دریا اور ان کے درمیان نہتا اور تنہا انسان، نہتا یوں کہ فکر و دانش میں پختگی پیدا نہ ہوئی تھی۔ وہ فطرت کی طاقتوں کے سامنے جھکنے لگا، انسان کا یہ ابتدائی مذہب (خود ساختہ) خود کا پیدا کردہ تھا۔ اس وقت انسان حوادث کے اسباب وعلل سے بھی واقف نہ تھا۔ فطرت کے مظاہر ہر جگہ خدا کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔'' (طلوعِ اسلام: اکتوبر ۱۹۵۹ء ص ۲۳)

علم الانسان کے اس فلسفہ کی رو سے جب انسانی معاشرہ کا آغاز مظاہر فطرت سے مرعوبیت کی بنا پر اُنہیں خدا ماننے کے صورت میں ہوا، تو ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کی رو سے ابتدائی انسانی زندگی میں نبوت و رسالت اور خدائی رشد و ہدایت کو ماننے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی جسے قرآن پیدائشِ آدمؑ کے ساتھ ہی آغاز پذیر قرار دیتا ہے اور ہمارے 'مفکرِ قرآن' چونکہ مغربی فلسفہ و تحقیق سے بُری طرح مرعوب و مغلوب ہیں اور اہل مغرب کی فکری غلامی اور ذہنی اسیری میں مبتلا ہیں لہٰذا وہ کسی ایسی صورت حال کے قائل نہیں ہو سکتے جس میں انسانی معاشرہ کی ابتدا نور وحی اور ضیاے ہدایت میں ہونا قرار پائے، کیونکہ وحی و ہدایت کا وجود نبوت و رسالت کے وجود کو مستلزم ہے۔ 'مفکرِ قرآن' کی طرف سے انکارِ نبوتِ آدم کی تہہ میں یہی مغربی فلسفہ کارفرما ہے۔

وہ قرآن کے حقائق اور جدید تحقیقات میں کہیں تضاد و تصادم پائیں تو ان کا رویہ یہ نہیں ہوتا کہ قرآنی حقائق کو حتمی، قطعی اور یقینی قرار دے کر 'جدید تحقیقات' کو یہ کہہ کر ردّ کر دیں کہ ''یہ تحقیقات ابھی خام ہیں، ممکن ہے مستقبل کے علمی انکشافات اُنہیں ردّ کر کے وہ چیز پیش کر دیں جو مطابق وحی ہو۔'' بلکہ وہ یہ روش اختیار کیا کرتے ہیں کہ ''قرآن کے اس مقام کی تشریح ممکن ہے کہ آئندہ کے علمی انکشافات اور آثارِ قدیمہ کے حقائق سے ہو جائے۔'' اس طرح وہ ہمیشہ قرآن پر ان تحقیقات کو شرفِ تقدم بخشا کرتے تھے جو اہل مغرب نے پیش کی ہوں، انکار نبوت آدم میں بھی یہاں یہی لم کارفرما ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ 'مفکرِ قرآن' کا راسخ ایمان قرآنِ کریم پر تھا؟..... یا تحقیقات مغرب پر؟''

www.KitaboSunnat.com

زہد و احسان

مولانا عمر فاروق سعیدی
تحقیق و تخریج: ادارہ 'محدث'

دل بدست آور؛ حدیثِ اِحسان و اِخلاص

ایک موقع پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور بعد میں آنے والے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف ایک عجیب اور منفرد انداز سے وحی ہوئی کہ ایک نوجوان، خوبرو، گھبرو رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتا ہے۔ آپؐ سے چند سوالات کرتا ہے، آپؐ ان کے جواب ارشاد فرماتے ہیں تو وہ سائل ہونے کے باوجود ان کی تصدیق کرتا ہے۔ صحابہؓ کو اس کے سوالات اور پھر جوابات کی تصدیق و توثیق سے بڑا اچنبا ہوا۔ پھر اس کے چلے بلکہ غائب ہوجانے کے بعد آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان حضرات کو بتایا کہ یہ آنے والا جبرئیل (علیہ السلام) تھا، اور تمہیں 'تمہارا دین' سکھانے آیا تھا۔

یہ سوال و جواب اس قدر اہم اور عظیم الشان ہیں کہ ایک انسان اور بالخصوص مسلمان کے عقیدہ و عمل، دین و دنیا اور ظاہر و باطن کے تمام اُمور کو محیط اور شامل ہیں۔

علماے حدیث اس واقعہ کو 'حدیثِ جبریلؑ' کے نام سے معنون کرتے ہیں۔ کئی ائمہ و علماء نے اس کی شروحات کی ہیں۔ بالخصوص حافظ ابن رجبؒ نے اپنی ایک نادرِ روزگار ربانی تالیف جامع العلوم والحكم في شرح خمسين حديثًا من جوامع الكلم میں دوسرے نمبر کی حدیث میں اس کی جامع شرح فرمائی ہے۔ میں نے اس میں سے اپنے لئے، اپنی اولاد و اَحفاد اور مخلص عزیزوں کے لیے 'اِحسان' اور ضمناً خشوع فی الصلوٰۃ والاذکار کے موضوع سے متعلق چند صفحات کا مطالعہ رواں اُردو میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ جو عزیز عربی سے براہِ راست استفادہ نہیں کرسکتے، وہ بھی اس 'آبِ حیات' سے کچھ جُرعات لے لیں۔ جس میں یقیناً دلوں کا نور، روح کا سرور اور سینوں کا اِنشراح ہے۔ ان سے زندگی کی کٹھنائیاں یقیناً آسان ہوسکتی ہیں اور اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ابنِ آدم کی روحیں، ہمیشہ

سے بے چین، پیاسی اور مشتاق رہی ہیں کہ کاش کہیں سے کوئی جانفزا جھونکا آئے تاکہ اس کثافت بھری دنیا میں کوئی سکھ کا سانس لے سکیں، کوئی اطمینان وسکون ملے، سُوکھے ہونٹوں کو تراوٹ اور نظروں کو طراوت ملے۔

اللہ ربّ العٰلمین، ارحم الراحمین نے اپنے بندوں کی جملہ مادی ضروریات کے ساتھ ساتھ ان کی حقیقی ضرورت وطلب یعنی قلبی و روحانی تسکین کے اسباب سے بھی اُنہیں خالی اور محروم نہیں چھوڑا ہے۔ اللہ کے پیغمبر ﷺ اور ان کی تعلیمات نے ہر دور میں آدم زاد کی یہ فطری ضرورت پوری فرمائی ہے اور بالخصوص رحمتہ للعالمین ﷺ کی آمد باسعادت کے بعد تو اس نعمت کا اتمام واکمال ہو چکا کہ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (الرعد:۲۸) ''خبردار! اللہ ہی کے ذکر میں دلوں کا اطمینان وسکون ہے۔'' مگر ایک بڑی تعداد ہے جو اس کے اعلانِ عام اور منادی کے باوجود اس طرف کان نہیں دھرتی اور اپنی طبعی اور روحانی بھوک پیاس کو کثافتوں سے مٹانے کی ناکام کوشش میں مگن رہتی ہے۔

'جامع العلوم والحکم' ساری کتاب ہی 'آبِ حیات' ہے۔ میں نے احسان واخلاص فی العبادت سے متعلق یہ چند صفحات اپنے قارئین کی نذر کئے ہیں اور نیت یہ ہے کہ کاش ہماری زندگیوں میں بالعموم اور عبادات واذکار میں بالخصوص اللہ کی طرف توجہ، اور اس کی طرف خاص دھیان حاصل ہو، اور زبان سے ادا ہونے والے کلمات اور جوارح سے صادر ہونے والی حرکات کی حقیقت ذہن میں مستحضر رہے تاکہ یہ اعمال فی الواقع 'عبادت' بنیں، محض عادت نہ رہ جائیں اور اللہ کے حضور درجاتِ عالیہ کا شرف پائیں اور ان انعامات و اِکرامات سے بہرہ ور ہوں جن کا وعدہ اس منعمِ حقیقی نے فرمایا ہے۔

اگر عبادات اور اذکار وتسبیحات میں محض رٹے رٹائے الفاظ دہرا دیئے جائیں اور جسم چند حرکات کر کے فارغ ہو جائے اور قلب و روح کو ان کی حقیقت کا علم ہی نہ ہو تو اس ساری کارگزاری اور ایک منتر کے عمل میں بظاہر کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ بے توجہ اور بے روح عبادت کا معاملہ اس رحمٰن و رحیم کے حضور ہے، چاہے تو قبول فرما لے اور عین ممکن ہے کہ ردّ بھی

کردے۔[1] واللہ المُستعان

یہ ظاہری افعال اور بے سمجھے کی تسبیحات اس بات کی تو یقیناً دلیل ہوتی ہیں کہ ان کا قائل و فاعل (اگر وہ فی الواقع منافق نہ ہو تو) بنیادی طور پر نعمتِ اسلام وایمان سے بہرہ ور ضرور ہے مگر عبادت کی حقیقت اور روح سے محروم ہے۔ جسے حاصل کرنے کے لیے ہر عالم و عامی کو بہر طور بہت زیادہ محنت، کوشش اور مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ نفس امارہ کا ٹٹو اس جادۂ حق واستقامت پر چلنے سے بالعموم انکاری ہوتا ہے یا چلتے چلتے بڑی جلدی بھٹک جاتا ہے ﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ﴾ (یوسف:۵۲) اور نماز میں وسوسہ ڈالنے والا شیطان خِنزب اسے معمولی سے اشارے سے دوسری راہ پر لگا دے تو یہ بے تکلف اسی کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے۔ ولاحول ولا قوۃ إلا باللہ۔ حافظ شیرازی لکھتے ہیں:

آقائے ما نگہدار آبروے گدائے خویش
کہ از جوے دیگراں پُر نکند پیالہ را[2]

راقم کے یہ غیر مرتب سے متواضع حروف اگر اصحابِ منبر ومحراب یا صاحبانِ درس وتدریس کی نظروں میں کچھ وقعت پائیں تو گزارش کروں گا کہ قرآنِ کریم کے درس، حدیثِ نبویؐ کے سبق اور اپنے خطبہ و درس میں مقام احسان اور خشوع فی الصلوٰۃ و الاذکار وغیرہ کو اپنا خاص

---

① جیسا کہ فرمانِ نبویؐ ہے: عن عبادة بن الصامت قال أشهد أني سمعت رسول الله ﷺ يقول: خمس صلوات افترضهن الله تعالىٰ من أحسن وضوء هن وصلاهن لوقتهن وأتمّ ركوعهن وخشوعهن كان له على الله عهد، أن يغفرله ومن لم يفعل فليس له على الله عهد إن شاء غفرله و إن شاء عذّبه (سنن ابوداؤد، :۴۲۵)
حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، فرمایا کہ پانچ نمازیں ہیں جو اللہ نے فرض کی ہیں، جو شخص ان کا وضو عمدہ بنائے، اُنہیں بروقت ادا کرے، ان کے رکوع اور 'خشوع' کامل رکھے تو ایسے شخص کے لیے اللہ تعالیٰ کا عہد اور وعدہ ہے کہ وہ اسے بخش دے گا اور جو یہ نہ کرے تو اُس کے لیے اللہ کا کوئی وعدہ نہیں ہے۔ چاہے تو بخش دے اور چاہے تو عذاب دے۔ (اللھم استر عوراتنا وآمن رَّوعاتنا..... آمین)

② ترجمہ: اے ہمارے آقا جل جلالہٗ! اپنے در کے اس گدا، سائل اور فقیر کی عزت و آبرو کی حفاظت فرمانا۔ یہ منگتا دوسروں کے ندی نالوں سے اپنے دستِ دعا کے پیالے کو بھر لینے کا کسی طور روادار نہیں۔

موضوع بنائیں۔ یقیناً یہ عظیم، اہم اور کرنے کا کام ہے۔ وباللہ التوفیق

حدیثِ جبرئیل علیہ السلام کا متن

عن عمر بن الخطاب قال بينما نحن [جلوس] عند رسول الله ﷺ ذات يوم إذ طلع علينا رجل شديد بياض الثياب، شديد سواد الشعر، لا يُرى عليه أثر السفر، ولا يعرفه منا أحد، حتى جلس إلى النبي ﷺ فأسند ركبتيه إلىٰ ركبتيه ووضع كفيه على فخذيه، وقال: يا محمد! أخبرني عن الإسلام؟ فقال رسول الله ﷺ: الاسلام :« أن تشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدًا رسول الله، وتقيم الصلاة وتؤتي الزكاة وتصوم رمضان وتحج البيت إن استطعت إليه سبيلا» . قال: صدقت،

قال: فعجبنا له يسأله ويصدقه

قال: فأخبرني عن الإيمان؟ قال: «أنْ تؤمن بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر، وتؤمن بالقدر خيره وشره» قال: صدقت.

قال: فأخبرني عن الإحسان؟ قال: «أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك» . قال: صدقت.

قال: فأخبرني عن الساعة؟ قال: «ما المسْؤول عنها بأعلم من السائل» .

قال: فأخبرني عن أماراتها، قال: «أن تلد الأَمَة ربتّها وَأن تَرٰى الحفاة العراة العالة رعاء الشاء يتطاولون في البنيان»

ثم انطلق فلبثتُ مليًّا ثم قال: يا عمر! أتدري من السائل؟ قلت: الله ورسوله أعلم. قال: «هٰذا جبريل أتاكم يُعلِّمُكم دينكم »

(صحیح بخاری:٥٠،صحیح مسلم:٩)

''سیدنا عمر بن خطابؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار اتفاق سے ہم رسول اللہ ﷺ کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک آدمی ہمارے سامنے آیا۔ انتہائی سفید کپڑے اور بال بڑے ہی سیاہ تھے۔ اس پر سفر کی علامات بھی نہ تھیں، اور نہ ہی ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ نبی ﷺ کے پاس بیٹھ گیا اور اپنے گھٹنے آپ کے گھٹنوں کے ساتھ ملا لئے، اور اپنی ہتھیلیاں آپ علیہ السلام کے گھٹنوں پر (یا اپنے گھٹنوں) پر رکھ لیں، اور کہنے لگا:

اے محمدؐ! مجھے اسلام کے متعلق بتایئے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تو اس بات کی شہادت (گواہی) دے کہ اللہ کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور محمدؐ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کر، زکوٰۃ دے، رمضان کے روزے رکھ اور اگر بیت اللہ تک پہنچنے کی استطاعت ہو تو اس کا حج کر۔ اس نے کہا: آپؐ نے سچ فرمایا۔ عمرؓ کہتے ہیں کہ ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ خود ہی سوال کرتا اور پھر اس کی تصدیق بھی کرتا ہے۔

پھر اس نے کہا: مجھے ایمان کے متعلق بتایئے؟ آپؐ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تو اپنے دل کی گہرائی سے اللہ کو مانے، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور رسولوں کو مانے، آخرت کے دن اور تقدیر کے بھلے بُرے ہونے پر یقین رکھے۔ اس نے کہا: آپؐ نے سچ فرمایا۔

اس نے کہا: مجھے 'احسان' کے متعلق فرمایئے؟ تو آپؐ نے فرمایا: تو اللہ کی عبادت اس طرح سے کر گویا کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے، اگر یہ کیفیت نہ ہو سکے تو یہ ہو کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ اس نے کہا: آپؐ نے سچ فرمایا۔

اس نے کہا: مجھے قیامت کے متعلق بتایئے؟ فرمایا: مسئول (جس سے تم پوچھ رہے ہو) اس کے متعلق خود سائل (پوچھنے والے) سے کچھ زیادہ نہیں جانتا۔

تو اس نے کہا: مجھے اس کی علامت بیان فرمائیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ تو دیکھے گا کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے گی اور تو دیکھے گا کہ پاؤں سے ننگے، جسم سے ننگے، تنگ دست، بکریوں کے چرواہے اونچی اونچی عمارات بنانے لگیں گے۔ پھر وہ چلا گیا۔

اور میں کچھ وقت ٹھہرا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے عمرؓ! جانتے ہو، یہ سائل کون تھا؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔

فرمایا: یہ جبرئیل علیہ السلام تھے، جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔''

احسان

'احسان'[3] کا قرآنِ کریم میں کئی مقامات پر ذکر آیا ہے۔ کہیں 'ایمان' کے ساتھ ملا کر، کہیں 'اسلام' کے ساتھ اور کہیں 'تقویٰ' اور 'عمل صالح' کے ساتھ، مثلاً:

③ سلفِ اُمت اور تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں للّٰہیت اور اخلاص کا حقیقی اور صحیح نام 'زہد و احسان' رہا ہے۔ امام ابن مبارک اور احمد بن حنبلؒ وغیرہ کی تالیفات میں 'کتاب الزہد' نام کی کتابیں معروف اور متداول ہیں۔ بعد میں اس عمل میں کچھ تحریف ہوئی اور بہت زیادہ ہوئی اور عجمیت نے بھی اس میں =

* ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَّآمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّأَحْسَنُوا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾

(المائدۃ:۵/۹۳)

''ایسے لوگوں پر جو ایمان رکھتے اور نیک کام کرتے ہوں اس بارے میں کوئی گناہ نہیں، جس کو اُنہوں نے کھایا (پیا) جبکہ وہ تقویٰ رکھتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں، پھر پرہیز گاری کرتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں پھر پرہیز کرتے ہوں اور (درجہ احسان میں) خوب نیک عمل کرتے ہوں تو اللہ ایسے نیکوکاروں (محسنین) سے محبت رکھتا ہے۔''

* ﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا﴾

''یقیناً جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں تو ہم کسی نیک عمل کرنے والے (محسن) کا ثواب ضائع نہیں کرتے۔'' (الکہف: ۱۸/۳۰)

* اسلام سے ملا کر فرمایا: ﴿بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (البقرۃ:۲/۱۱۲)

''سنو! جو بھی اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جھکا دے اور وہ (محسن ہوکر) اخلاص سے عمل کرے تو بیشک اس کا رب اسے پورا پورا بدلہ دے گا، اس پر نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ غم اور اداسی''

* ﴿وَمَنْ يُسْلِمْ وَجْهَهُ إِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾

''جو شخص اپنے چہرے کو اللہ کی طرف متوجہ کر دے اور وہ ہو بھی نیکوکار (محسن) تو یقیناً اس نے ایک مضبوط کڑا تھام لیا'' (لقمان:۳۱/۲۲)

* تقویٰ کے ساتھ ملا کر یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾

= دراندازی کی تو اس کا نام 'تصوف' اور 'طریقت' ٹھہرا اور اسے شریعت کا حریف اور اس کے بالمقابل لا کھڑا کیا گیا اور بدعات کے سیلاب نے زہد واحسان کے اس چشمہ صافی کو اس قدر گدلا یا کہ اب اسے یہاں ہی پناہ ملتی ہے، وگرنہ مخلص اہل نظر بخوبی جانتے ہیں کہ دنیا سے بے رغبتی اور عبادات میں احسان شریعت کا ایک انتہائی اہم مقام و مرتبہ ہے اور اس حقیقت میں کوئی خفا نہیں کہ دل کی دنیا پر قابو پانا ایک مستقل علم اور عمل ہے جو بہت زیادہ محنت اور مجاہدہ چاہتا ہے اور جس طرح دیگر علوم محض کتاب سے حاصل نہیں ہوسکتے، ان کے لیے مخلص اور محنتی معلّم کی ضرورت ہوتی ہے تو یقیناً اس شعبہ کے لیے بھی ربانی وحقانی مربی ہی انسان کی اچھی تربیت کرسکتا ہے۔ (سعیدی)

''جنہوں نے (درجہ احسان میں) نیکی کی تو ان کیلئے خوبی ہے اور مزید بھی۔'' (یونس:۱۰/۲۶)

* صحیح مسلم میں اس 'مزید' کی یہ وضاحت آئی ہے کہ اس سے مراد جنت میں 'اللہ عزوجل کے چہرۂ انور کا دیدار' ہے جو اِن محسنین کے عمل احسان کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے ہوگا کیونکہ ان کے اعمال درجہ احسان تک اسی وجہ سے بلند ہوئے کہ وہ دنیا میں رہتے ہوئے اپنے ربّ کی عبادت ایسے حضورِ قلبی اور اپنے ربّ کے مراقبہ کی کیفیت میں کرتے تھے گویا وہ اسے اپنے دل سے دیکھ رہے ہوتے تھے تو اس کی جزا ان کے لیے یہ ہوئی کہ وہ آخرت میں اپنے اللہ کو اپنی آنکھوں سے عیاناً دیکھیں گے۔ جبکہ ان کے برعکس کفار کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ

﴿إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ﴾ (المطففین:۸۳/۱۵)

''یہ کفار...... اس دن اپنے ربّ سے اوٹ میں رکھے جائیں گے۔''

اور یہ ان کے اس حال کا بدلہ ہوگا جو وہ دنیا میں کرتے رہے کہ ان کے دلوں پر گناہوں کے زنگ کی تہیں جمتی رہیں اور اُنہیں اس حال تک پہنچا دیا کہ اُنہیں اللہ کی معرفت اور اس کے مراقبہ کا کبھی کوئی خیال نہ آتا تھا تو آخرت میں اللہ عزوجل کے دیدار کی نعمت اور اِعزاز سے محروم ہوگئے۔

* اور رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانِ مبارک جس میں آپؐ نے احسان کی یہ تفسیر وتوضیح فرمائی ہے کہ «أن تعبد الله كأنك تراه» ''تو اپنے اللہ کی عبادت ایسے اور اس کیفیت میں کر گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔'' اس کیفیت کے طاری ہونے کا حاصل اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ عزوجل کے سامنے حاضر پاتا ہے، گویا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ اس سے بندے میں اللہ کی خشیت، خوف، ہیبت اور تعظیم کے جذبات میں اضافہ ہوتا ہے جیسے کہ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے «أن تخشى الله كأنك تراه» (صحیح مسلم:۱۰)

''تو اللہ سے اس طرح ڈر گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہو۔''

ان تعلیمات کا لازمی تقاضا اور مطالبہ یہ ہے کہ بندہ اپنے اللہ کی عبادت میں خلوص کی انتہا کے اس مقام تک پہنچنے کی کوشش کرے اور عبادت کے اکمال و اتمام اور تحسین میں اپنی تمام توانائیاں صرف کردے۔

* نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے کئی صحابہ کو اس بات کی وصیت فرمائی تھی جیسے کہ ابراہیم ہجری، ابوالاحوص سے اور وہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ

أوصاني خليلي ﷺ أن أخشى الله كأني أراه فإن لم أكن أراه فإنه يراني ④

''مجھے میرے خلیل ﷺ نے وصیت فرمائی کہ میں اللہ سے ڈروں گویا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں، اگر میں یہ (کیفیت طاری) نہ کرسکوں تو یہ ہو کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔''

* حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ

أخذ رسول الله ﷺ ببعض جسدي فقال: «أعبدالله كأنك تراه»

''رسول ﷺ نے میرے جسم کا ایک حصہ دبایا (یا پکڑا) اور فرمایا اللہ کی عبادت ایسے کیا کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو۔'' (حلیۃ الأولیاء: ۱۱۵/۶؛ السنن الکبریٰ للنسائی؛ تحفۃ الاشراف: ۲۷۸/۵ 'صحیح')

* سیدنا جناب زید بن ارقم سے مرفوعاً وموقوفاً دونوں طرح آیا ہے، فرمایا:

«كن كأنك ترى الله فإن لم تكن تراه فإنه يراك» ⑤

''ایسے رہا کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اگر یہ کیفیت نہ ہوسکے تو یہ خیال کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' (حلیۃ الأولیاء: ۲۰۲/۸، مرفوعاً یہ حدیث ضعیف ہے، لسان المیزان ۱۰۹/۷)

* طبرانی میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ

أن رجلاً قال يا رسول الله ﷺ حدثني بحديث واجعله مُوجزًا فقال: «صلِّ صلاة مودّع» (المعجم الکبیر للطبرانی:)

''ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! مجھے کوئی تلقین فرمائیں اور چاہئے کہ مختصر ہو۔ فرمایا: نماز ایسے پڑھا کرو گویا یہ تمہاری آخری الوداعی نماز ہے۔''

* حارثہؓ کی مشہور روایت ہے جو متصل ومرفوع اسانید سے مروی ہے مگر مرسل زیادہ صحیح ہے:

---

④ 'اللہ سے ڈرنے' کی آیات واحادیث میں 'ڈر اور خوف' سے مراد وہ قلبی وروحانی کیفیت ہوتی ہے جس میں اُلفت، محبت، ہیبت، جلال، تعظیم اور قرب کے جذبات ہوتے ہیں۔ بندہ گھبراتا ہے کہ کہیں مجھ سے کوئی غلطی نہ ہوگئی ہو یا ہو نہ جائے اور ساتھ ہی اس کی قربت ومحبت اور انعام و اِکرام کا بھی یقین رکھتا ہے، جیسے ایک سعادت مند بیٹے کا اپنے باپ سے تعلق ہوتا ہے۔ ولله المثل الأعلىٰ اور اللہ تعالیٰ کا مقام تو بے انتہا اعلیٰ وارفع ہے۔

⑤ اس ارشاد میں یہ تلقین عام ہی فرمائی گئی ہے، خواہ عبادت میں ہو یا نہ ہو۔

"أن النبي ﷺ قال له يا حارثة! كيف أصبحتَ؟ قال: أصبحتُ مؤمنًا حقًّا، قال: أنظر ما تقول، فإن لكل قول حقيقةً. قال: يا رسول الله ﷺ! عزفَتْ نفسي عن الدنيا فأسهرتُ ليلي و أظمأت نهاري، وكأني أنظر إلىٰ عرش ربي بارزًا، وكأني انظر أهل الجنة في الجنة كيف يتزاورون فيها، وكأني أنظر إلىٰ أهل النار كيف يتعاودون فيها، قال: أبصرت فالزم، عبد نوَّر الله الايمان في قلبه" (شعب الایمان از امام بیہقی: ۱۰۵۹۰ 'ضعیف')

''نبی ﷺ نے پوچھا: اے حارثہ! کس حال میں تو نے صبح کی ہے؟ اُنہوں نے کہا: حضرت! مؤمنِ حق ہوتے ہوئے میں نے صبح کی ہے! آپؐ نے فرمایا: سوچ تو کیا کہہ رہے ہو؟ ہر بات کی ایک حقیقت ہوتی ہے؟ اُنہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے اپنے آپ کو دنیا سے بے رغبت کرلیا ہے، راتوں کو جاگتا ہوں، دن میں اپنے آپ کو پیاسا رکھتا ہوں، ایسے محسوس کرتا ہوں جیسے اپنے ربّ کے عرش کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ گویا اہل جنت کو دیکھ رہا ہوں کہ کیسے کیسے ایک دوسرے کی زیارت کو جارہے ہیں اور اہل نار کو دیکھتا ہوں کہ کیسے کیسے بھگت رہے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا: تو نے بصیرت حاصل کرلی ہے۔ تو اب اسے لازم پکڑے رہنا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ایسا بندہ ہے کہ اللہ نے اس کے دل کو ایمان سے منور کردیا ہے۔''

اللہ سے حیا کرنا

* حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو وصیت فرمائی اور کہا:

استحي من الله استحياءك من رجلين من صالحي عشيرتك لايفارقانك

''اللہ سے ایسے حیا کرو جیسے تم اپنے قوم قبیلے کے دو صالح بندوں سے حیا کرتے ہو، جو تم سے جدا نہیں ہوتے۔'' (المعجم الکبیر للطبرانی: ۷۸۹۷، 'ضعیف')

* کتاب الزہد کی مرسل روایت میں ہے: استحي من ربك ''اپنے ربّ کا حیا کیا کرو۔'' (۲۴۸)

* حضرت معاذؓ کو جب یمن بھیجا گیا تو آپ ﷺ نے اُنہیں ایک وصیت یہ بھی فرمائی تھی:

استحي من الله كما تستحي من رجل ذا هيبة من أهلك (البزار: ۲۶۴۲ ضعیف)

''اپنے ربّ سے اسی طرح حیا کرو جیسا کہ تم اپنے اہل کے کسی باہیبت آدمی سے حیا کرتے ہو۔''

* ایک بار کسی نے آپ ﷺ سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ کیا آدمی جب اکیلا ہو تو بے لباس اور

عریاں ہو جائے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «الله أحق أن يستحيا منه» (سنن ابو داود: ۴۰۱۷ 'حسن') ''اگر سامنے اور کوئی آدمی نہ بھی ہو تو اللہ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے حیا کیا جائے۔'' (یعنی اکیلے میں بھی آدمی کو لایعنی طور پر بے لباس عریاں نہیں ہونا چاہئے)

* صحابی رسول حضرت ابوالدرداءؓ نے ایک آدمی کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

"اُعبدالله كأنك تراه" (حلية الأولياء:۲۱۱/۱)

''اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔''

* ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ طواف میں تھے، اور عروہ بن زبیرؒ بھی ...... کہ اس دوران عروہ نے جناب عبداللہؓ سے ان کی صاحبزادی کے متعلق نکاح کی بات کرنا چاہی تو حضرت عبداللہؓ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ مدینہ منورہ واپس پہنچے تو دورانِ طواف میں جواب نہ دینے پر معذرت کی، اور کہا کہ ''بھئی! اس وقت جب تم نے بات کی تھی، ہم طواف کر رہے تھے اور اس دوران میں تو ہم اپنے اللہ کو اپنے سامنے خیال کرتے ہیں۔'' (حلیہ: ۳۰۹/۱)

☆...... رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے: «فإن لم تكن تراه فإنه يراك» ''اگر تم پہلے والی کیفیت حاصل نہ کر سکو تو یہ ضرور ہو کہ خیال کرو کہ وہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے''

یہ جملہ گویا پہلے کی علت اور سبب ہے۔ بندے کو جب حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اللہ کو اپنے تصور میں لائے، کہ دورانِ عبادت وہ اسے دیکھ رہا ہے، اور وہ اپنے بندے کے بہت زیادہ قریب ہے، اتنا قریب کہ بندہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ کیفیت نہ بن سکے تو اسے اپنے اس ایمان سے مدد لینی چاہئے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے، وہ اس کے ظاہر اور باطن سے آگاہ ہے اور اس کی کوئی حالت اور کیفیت اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ بندہ جب یہ مقام و مرتبہ حاصل کر لے گا تو اس طرح اس کے لیے پہلے مقام کا حصول بہت آسان ہو جائے گا کہ اس پر یہ کیفیت اور بصیرت طاری رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے بے انتہا قریب ہے، اس کی معیت میں ہے یا کم از کم اسے دیکھ رہا ہے۔

اور کہا جاتا ہے کہ جس شخص کے لیے اس کیفیت میں عبادت کرنا مشکل ہو تو اسے یہ دوسری کیفیت ضرور ہی طاری کرنی چاہئے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے، اسے جھانک رہا ہے تو اسے اس سے حیا کرنی چاہئے کہ اس سے کوئی خلاف ادب بات یا فعل صادر ہو۔

عارفین کے کچھ اقوال

* بعض عارفین کا قول ہے: اس بات سے ڈرو کہ کہیں اللہ تمہیں حقارت سے نہ دیکھتا ہو۔
* بعض نے کہا: اللہ سے ڈرو اور خیال کرو کہ وہ تم پر کس قدر عظیم قدرت رکھتا ہے۔
* بعض نے کہا: عارف تو وہ ہے جو اللہ کے لیے عمل کرے اور اس تصور سے کرے گویا وہ اسے دیکھتا ہے اور جو اس کیفیت سے عبادت کرے کہ ''اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔'' تو وہ 'مخلص' ہوتا ہے۔

اور اس قول میں مذکورہ بالا دونوں مراتب و مقامات کی طرف اِشارہ ہے۔ یہ دوسرا مرتبہ، مقامِ اخلاص ہے اور اس کا لازمی تقاضا ہے کہ بندہ عبادت میں اِدھر اُدھر نہ جھانکے، صرف اس کی رضا کو پیش نظر رکھے اور پہلا مقام، مقامِ مشاہدہ ہے یعنی بندہ اپنے دل میں یہ تصور جمائے اور اس طرح کے حضور قلب سے عبادت کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کے مشاہدہ میں ہے۔ اس طرح اس کا دل ایمان سے منوّر اور اس کی بصیرت مقامِ عرفان تک پہنچ جائے گی۔ حتیٰ کہ غیب عیاں بن جائے گا اور یہی وہ مقامِ احسان ہے جس کا حدیث جبریل میں بیان ہوا ہے۔

اور ان مقامات کے اصحاب اپنے اپنے درجاتِ بصیرت کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔

اور علماء کی ایک جماعت نے آیتِ کریمہ ﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (الروم:۳۰/۲۷) ''اس کی بہترین اور اعلیٰ صفت ہے، آسمانوں میں اور زمین میں بھی'' ...... میں 'مثل اعلیٰ' کی یہی تفسیر کی ہے جس کا اوپر بیان ہوا ہے۔

اس طرح سورۃ النور کی آیت ۳۵ میں ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ...﴾ کی تفسیر میں یہی بیان کرتے ہیں کہ ''اللہ کے نور کی مثال جو مؤمن کے دل میں ہوتا ہے، مثل ایک طاق کے ہے جس میں چراغ ہو اور چراغ شیشے کی قندیل میں ہو اور شیشہ مثل چمکتے ہوئے روشن ستارے کے ہو...... الخ''

اُبی بن کعبؓ وغیرہ صحابہ سلف اُمت سے اس کی یہی تفسیر وارد ہے۔ (تفسیر طبری: ۱۹۷۵۷)

* اور احادیث میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے کہ «أفضل الایمان أن تعلم أنّ الله معك حیث کنتَ» (مسند الشامیین للطبرانی:۵۲۰) ''سب سے افضل ایمان یہ ہے کہ

تمہیں علم و یقین ہو کہ تم جہاں کہیں بھی ہوئے، اللہ تمہارے ساتھ ہے۔''

* طبرانی میں حضرت ابوامامہؓ سے یہ روایت آتی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«ثلاثه في ظل الله يوم القيامة يوم لا ظل إلا ظله: رجل حيث توجه عَلِمَ أن الله معه» (طبرانی:۹۷۳۵ واسنادہ ضعیف جدا فیہ بشیر بن نمیر متروک، مجمع الزوائد: ۲۷۹/۱۰)

''تین قسم کے آدمی قیامت کے دن اللہ کے سائے میں ہوں گے جس دن اللہ کے سائے کے علاوہ کہیں کسی کا کوئی سایہ نہ ہوگا، ان میں ایک وہ ہوگا جو جہاں کہیں بھی جائے اسے یقین ہو کہ اللہ اس کے ساتھ ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی معیت کا تذکرہ؛ قرآن وسنت میں

قرآنِ مجید کے متعدد مقامات میں اس کا ذکر ہے، فرمایا:

* ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾ ''وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے، تم جہاں کہیں بھی ہو۔''

* ﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ...﴾

''جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں پوچھیں تو انہیں بتائیں کہ میں قریب ہوں۔''

*اور فرمایا: ﴿مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنَىٰ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَمَا كَانُوا.....﴾ (المجادلہ:۷/۵۸)

''تین آدمیوں کی سرگوشی نہیں ہوتی مگر اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے، اور نہ پانچ کی مگر ان کا چھٹا وہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم کی اور نہ زیادہ کی مگر وہ انکے ساتھ ہی ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں۔''

* اور فرمایا: ﴿وَمَا تَكُونُ مِنْ شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ﴾ (یونس:۶۱/۱۰)

''اور آپ کس حال میں ہوں اور مجملہ ان احوال کے آپ کہیں سے قرآن پڑھتے ہوں اور جو کام بھی کرتے ہوں، ہم کو سب کی خبر رہتی ہے، جب تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو۔''

* اور فرمایا: ﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ (ق:۱۶/۵۰)

''اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں''

* اور فرمایا: ﴿يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ...﴾

''یہ لوگوں سے تو چھپ جاتے ہیں (لیکن) اللہ سے نہیں چھپ سکتے اور وہ ان کے ساتھ ہوتا

ہے۔" (النساء:۴/۱۰۷)

اور احادیثِ طیبہ صحیحہ میں بھی اس بات کا ذکر موجود ہے کہ بندے کو چاہئے کہ عبادات میں بالخصوص اللہ تعالیٰ کے اس قرب کو اپنے دل و دماغ میں حاضر رکھے، مثلاً:

* «إن أحدكم إذا قام يصلّي فإنما يناجي ربّه» (صحیح بخاری:۴۰۵)

"تم میں سے جب کوئی نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے مناجات کر رہا ہوتا ہے۔"

* یا اس طرح بھی آتا ہے: «ربّه بينه وبين القبلة» (صحیح بخاری:۴۰۵)

"نماز کے وقت اس کا ربّ اس کے اور قبلے کے درمیان ہوتا ہے۔"

* یا یہ الفاظ آئے ہیں: «إن الله قبل وجهه إذا صلّى» (صحیح بخاری:۴۰۶)

"جب بندہ نماز پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کے سامنے ہوتا ہے۔"

* ایک روایت کے لفظ اس طرح ہیں :

«إن الله ينصب وجهه لوجه عبده في صلاة ما لم يلتفت» [6] (ترمذی:۲۸۶۳)

"اللہ تعالیٰ نماز کے دوران اپنا چہرہ بندے کے چہرے کی طرف کر لیتا ہے جب تک کہ وہ التفات نہ کرے۔"

* ایک بار صحابہ کرامؓ سے تکبیر پکارنے میں آوازیں کچھ بلند ہوگئیں، تو آپ علیہ السلام نے اُنہیں سمجھایا کہ

«إنكم لا تدعون أصم ولا غائبًا إنكم تدعون سميعًا قريبًا» (بخاری:۴۲۰۲)

"تم لوگ کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکارتے ہو بلکہ اس ذات کو پکارتے ہو، جو خوب سننے والا قریب ہے۔"

* اور ایک روایت میں آیا ہے کہ «وهو أقرب إلىٰ أحدكم من عنق راحلته»

"وہ تو تم سے تمہاری سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔" (صحیح مسلم:۲۷۰۴)

* اور ایک روایت کے الفاظ ہیں: «هو أقرب إلى أحدكم من حبل الوريد»

"وہ تو تم سے تمہاری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے۔" (فتح الباری لابن رجب:۲/۴۰۵)

---

[6] اور التفات یعنی نظروں سے ادھر ادھر جھانکنا اور یہ کام دل بھی کرتا ہے کہ ادھر ادھر بھٹکتا رہتا ہے اور یہ نظروں سے زیادہ سخت اور پریشان کن ہوتا ہے۔ (سعیدی)

* اسی طرح ایک حدیثِ قدسی یہ ہے:

«أنا مع عبدي حيثما ذكرني وتحرَّكت بي شفتاه» (صحیح بخاری:۷۵۲۴)

''میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا اور میرے ذکر کے ساتھ اس کے ہونٹ حرکت کرتے ہیں۔''

* اور حدیثِ قدسی ہے کہ «أنا عند ظن عبدي بي وأنا معه حين يذكرني فإن ذكرني في نفسه ذكرته في نفسي، وإن ذكرني في ملأ ذكرته في ملأ هم خير منهم، وإن تقرب مني شبرًا تقربت منه ذراعًا وإن تقرب مني ذراعًا تقربت منه باعًا وإن أتاني يمشي، أتيته هرولةً»

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میں اپنے بندے کے میرے متعلق گمان کے مطابق ہوتا ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جہاں بھی وہ مجھے یاد کرے، اگر وہ مجھے اپنے جی میں یاد کرے تو میں اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں، اگر وہ مجھے کسی جماعت میں یاد کرے تو میں اسے اس کی جماعت سے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ میری طرف ایک بالشت قریب ہو تو میں ایک ہاتھ برابر اس کی طرف قریب ہوجاتا ہوں۔ اگر وہ میری طرف ایک ہاتھ قریب ہو تو ایک باع (دونوں بازوں کے پھیلاؤ) برابر اس سے قریب ہوجاتا ہوں اگر وہ میری طرف چل کے آئے تو میں اس کی طرف دوڑ کے آتا ہوں۔'' (صحیح مسلم:۲۶۷۵)

تو اگر کوئی ان نصوص سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں حلول یا اتحاد وغیرہ کے مفہوم سمجھتا اور کشید کرتا ہے تو یہ اس کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے متعلق سوءِ فہم اور جہالت ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسولؐ ان معانی و مفاہیم سے بری ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس کے مثل کوئی نہیں اور وہ خوب سننے والا دیکھنے والا ہے۔

متقی و زاہد حضرات کے بعض اقوال

◉ جناب بکر مزنیؒ کہتے ہیں: ''اے ابنِ آدم! تیرے جیسا کون ہے؟ تیرے، تیرے محراب اور بحر (اُنس و معرفت) میں کوئی رکاوٹ نہیں، تم جب چاہو اپنے اللہ کے حضور حاضر ہوسکتے ہو، اور تمہارے اور اللہ کے درمیان کوئی ترجمان بھی نہیں ہوتا۔

اور جب کوئی ذکر و عبادت میں حضور و استحضار کا یہ مقام حاصل کرلیتا ہے تو وہ اللہ کا انیس

بن جاتا ہے اور پھر لازمی طور پر دیگر مخلوقات سے اسے وحشت سی ہونے لگتی ہے۔''

(حلیة الأولیاء:۲/۲۲۹)

◉ ثور بن یزیدؒ کہتے ہیں کہ'' میں نے کسی کتاب میں پڑھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے جماعتِ حواریین! اللہ کے ساتھ بہت زیادہ اور لوگوں کے ساتھ بہت کم باتیں کیا کرو۔ اُنہوں نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت زیادہ کلام کیسے کریں؟ فرمایا: اس کے ساتھ مناجات کے لیے خلوت اختیار کرو، اور خلوت میں اس سے دعائیں کیا کرو۔''

(حلیة الأولیاء:۶/۱۹۵)

◉ اسی طرح جناب رباحؒ سے روایت کیا کہ'' ایک آدمی ہر دن رات میں ہزار رکعتیں پڑھتا تھا[۷] حتیٰ کہ وہ کھڑا ہونے سے معذور ہوگیا تو بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ وہ جب عصر کی نماز پڑھ لیتا تھا تو اپنے گھٹنوں کو اپنے بازوں میں لے کر احتباء کی صورت میں بیٹھ جاتا اور قبلہ کی طرف منہ کر لیتا اور کہتا تھا: مجھے اس مخلوق پر تعجب ہے وہ کس طرح اور کیونکر تیرے علاوہ کسی اور سے دل لگائے ہوئے ہیں۔ مجھے اس مخلوق پر تعجب ہے کہ ان کے دل کیونکر تیرے علاوہ کسی دوسرے کے ذکر کے ساتھ مانوس ہیں؟'' (ایضاً)

◉ ابواسامہؒ کہتے ہیں کہ'' میں جناب محمد بن نصر حارثیؒ کے ہاں گیا تو میں نے اُنہیں محسوس کیا کہ وہ کچھ منقبض سے ہیں، ان کی طبیعت میں گھٹن سی ہے۔ میں نے کہا: شاید آپ کو ناگوار لگتا ہے کہ آپ کے پاس آیا جائے۔ اُنہوں نے کہا: ہاں[۸]

میں نے کہا: تو کیا آپ کو اس طرح اکیلے بیٹھے رہنے سے وحشت اور گھبراہٹ نہیں ہوتی؟

---

[۷] اس طرح کے جملے بہت سے صوفیاء وزاہدین کے متعلق تواتر کے ساتھ لکھنے پڑھنے میں آتے ہیں۔ تاہم ہزار رکعت کی ادائیگی مسنون انداز میں بہت ہی بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ چوبیس گھنٹوں کے منٹ ہی بنالئے جائیں تو ایک ہزار چار سو چالیس (۱۴۴۰) بنتے ہیں۔ پھر عبادت کے لیے مکروہ وممنوع اوقات نکال لیے جائیں تو ایک منٹ میں ایک رکعت بڑے تعجب کی بات ہے۔ اِلاّ یہ کہ یہ تاویل کرلی جائے کہ ان جملوں میں تعداد مراد ہی نہیں ہوتی، محض کثرت کے معنی میں یہ عدد بول دیا گیا ہے۔ واللہ أعلم بالصواب! اور حقیقت یہ ہے جو للّٰہیت، خشوع وخضوع اور راحت وسکون رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ میں ہے، اور کہیں نہیں ہوسکتا۔ والحمدللہ علیٰ ذلك (سعیدی)

اُنہوں نے کہا: مجھے گھبراہٹ کیوں ہو؟ جب کہ وہ (اللہ تعالیٰ) فرماتا ہے: میں ہم مجلس ہوتا ہوں اس کا جو مجھے یاد کرے۔'' (شعب الایمان:۷۰۹)

◉ جناب مالک بن مغولؒ اپنے گھر میں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے تو اُن سے کہا گیا: ''کیا آپ کو اپنے اکیلے بیٹھے رہنے سے گھبراہٹ نہیں ہوتی؟'' تو اُنہوں نے کہا: ''کیا بھلا کوئی اللہ کی معیت میں بھی گھبرا سکتا ہے؟'' (فتح الباری لابن رجب:۱/۱۹۵)

◉ جناب حبیب ابومحمدؒ اپنے گھر میں اکیلے ہی بیٹھے ہوتے تھے اور کہا کرتے تھے: ''اے اللہ! جس کی آنکھ تیری معیت میں ٹھنڈی نہیں ہوتی، اس کی آنکھیں ٹھنڈی نہ ہوں۔ جسے تجھ سے اُنس نہیں ملتا اسے کہیں کوئی اُنس نہ ملے۔'' (حلیۃ الأولیاء:۸/۱۰۸)

◉ جناب غزوانؒ کہا کرتے تھے: ''میں اپنے دل کی راحت اُس کی مجالست اور صحبت میں پاتا ہوں جس کے ہاں میری حاجات ہیں۔''

◉ مسلم بن یسارؒ کا قول ہے: ''لذت کے متوالوں کو اللہ تعالیٰ سے مناجات کے لیے خلوت سے بڑھ کر اور کہیں کوئی لذت نہیں۔'' (حلیۃ الأولیاء:۲/۲۹۴)

◉ مسلم بن عابدؒ کا قول ہے کہ ''اگر جماعت کے اہتمام کی پابندی نہ ہوتی تو میں اپنے دروازے سے کبھی باہر نہ نکلتا حتیٰ کہ مجھے موت آجاتی۔''

اللہ کے مطیع بندوں کے لیے اس دنیا میں اپنے آقا کے ساتھ مناجات کے لیے خلوت سے بڑھ کر اور کوئی چیز لذیذ و شیریں نہیں ہوتی۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ ان کے سینوں میں میں آخرت کے ثواب اور اللہ کے دیدار سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہوگی'' پھر ان پر غشی طاری ہوگئی۔

◉ جناب ابراہیم بن ادہمؒ کا بیان ہے کہ

"أعلىٰ الدرجات أن تنقطع إلىٰ ربك وتستأنس إليه بقلبك وعقلك وجميع جوارحك حتى لا ترجو إلاّ ربك ولا تخاف إلاّ ذنبك وترسخ محبته في قلبك حتى لا تؤثر عليها شيئًا فإذا كنت كذلك لم تنل في برّ

⑧ بعض لوگ علماء و صالحین کے پاس محض تبرک کے طور پر جا بیٹھتے اور ان کے علمی و عملی مشاغل میں حارج بنتے ہیں اور پھر وہ بے مقصد طور پر مجلس کو طول بھی دیتے ہیں۔ شاید اسی قسم کے لوگوں سے انقباض کا ذکر ہوا ہے۔ واللہ اعلم (سعیدی)

كنت أو بحر أو في سهل أو في جبل وكان شوقك إلىٰ لقاء الحبيب شوق الظمآن إلى الماء البارد وشوق الجائع إلى الطعام الطيب، ويكون ذكر الله عندك أعلىٰ من العسل وأعلىٰ من الماء العذب الصافي عند العطشان في اليوم الصائف" (حلية الأولياء:٦٧/٨)

''سب سے عظیم درجہ اور مقام تو یہ ہے کہ تم مخلوقات سے کٹ کر[9] اللہ کے ہو رہو اور اپنے عقل وشعور اور تمام اعضاء و جوارح کے ساتھ اللہ کے اُنیس بنو حتیٰ کہ تمہاری ساری کی ساری اُمیدیں اللہ ہی سے وابستہ ہو جائیں۔ اور اپنے قصوروں اور گناہوں سے ڈرتے رہو۔ اللہ کی محبت کو اپنے دل میں اس طرح سے جماؤ حتیٰ کہ کسی اور شے کو اس پر ترجیح حاصل نہ رہے۔ اگر تم اس طرح کے ہو گئے تو پھر خواہ جنگل میں ہوئے یا سمندر میں، کسی میدان میں ہوئے یا پہاڑ پر، تو پھر تمہارا شوق اپنے حبیبِ حقیقی جل جلالہ کی ملاقات کے لیے ایسے ہوگا جیسے کسی پیاسے کو ٹھنڈے میٹھے پانی کی طلب ہوتی ہے، کسی بھوکے کو بہترین لذیذ کھانے کی خواہش ہوتی ہے۔ اللہ کا ذکر تمہارے لیے شہد سے بڑھ کر شیریں اور ٹھنڈے میٹھے صاف پانی کی خواہش سے بڑھ کر ہو جائے گا جو کسی تپتے دن میں ہو سکتی ہے۔''

- جناب فضیلؒ کا قول ہے: ''مبارک ہے وہ شخص جو لوگوں کے جمگھٹوں سے گھبرا کر اللہ کا جلیس وانیس بن گیا۔'' (حلية الأولياء:١٠٨/٨)
- ابوسلیمانؒ کہتے ہیں: ''میں کبھی بھی اللہ تعالیٰ کو بھول نہیں سکتا ہوں۔''
- جناب معروف کرخیؒ نے ایک آدمی سے کہا: ''اللہ تعالیٰ پر تمہارا توکل اور اعتماد ایسا اور اس قدر ہو کہ وہ تمہارا جلیس وانیس بن جائے اور پھر تم اپنی جمیع حاجات اسی کو سنواسکو۔'' (حلية الأولياء:٣٦٠/٨)
- ذوالنون مصریؒ سے منقول ہے کہ ''اہل محبت کی علامت یہ ہے کہ اُنہیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کہیں اور سے اُنس نہیں ملتا اور اس کی معیت سے اُنہیں کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی (یعنی

---

[9] اللہ تعالیٰ کے ذکر کا یہ مفہوم نہیں سمجھنا چاہئے کہ آدمی بس کسی زاویہ میں معتکف ہو کر بیٹھ رہے اور معاشرتی حقوق وفرائض (شرعی) سے غافل ہو رہے بلکہ علماء ربانی نے اس کی یہ وضاحت فرمائی ہے کہ گھر بار کے جمیع حقوق وفرائض اور کسب رزق وغیرہ کی تمام تگ ودو جو شرعی تقاضوں اور دینی آداب کے ساتھ ہو، 'اللہ کے ذکر' میں ہی شمار ہوتی ہے۔ اور مخلوقات سے کٹنے کا مفہوم بھی یہی ہے کہ لوگوں کے ساتھ روابط اور مجلس آرائی کسی عظیم تر پاکیزہ اور مفید مقاصد ومطالب کے تحت ہی ہو۔ (سعیدی)

لوگوں کے نہ ملنے سے اُنہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔)'' (فتح الباری لابن رجب:۱/۱۹۵)

اور فرمایا: ''جب اللہ کی محبت دل میں جاگزیں ہوجاتی ہے تو اس بندے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُنس ہوجاتا ہے۔ پھر اللہ کی ذات اہل معرفت کے سینوں میں سب سے عظیم ہوجاتی ہے اور یہ بھی سب سے کٹ کر اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔''

الغرض علماء و زہاد کے اس طرح کے اَقوال بے شمار ہیں، جن کا احاطہ تطویل کا باعث ہوگا جو ذکر ہوگیا، اس میں بڑی کفایت ہے۔ ان بیانات کی روشنی میں اس حدیث (حدیثِ جبریلؑ) کی عظمتِ شان کا پتا چلتا ہے کہ یہ حدیث تمام علوم و معارف کی جامع ہے اور ہر طرح کے علوم و حکم اس کی طرف راجع ہیں اور اُمت کے عظیم علماء و بزرگان کے علمی جواہرات جو وہ پیش کرتے ہیں، اس حدیث سے باہر نہیں ہوتے جبکہ فقہاے کرام کا موضوعِ بحث عبادات کا ظاہر ہوتا ہے جو یقیناً اسلام کے بنیادی خصائل میں سے ہے، اس کے بعد وہ اَموال، عصمتوں اور خونوں کے حقوق کی بحث کرتے ہیں جو سبھی بلا شبہ علومِ اسلامیہ کا عظیم حصہ ہیں۔ مگر ان حضرات سے اسلام کی معنویات یعنی آداب و اخلاق کا ایک بڑا حصہ رہ بھی جاتا ہے، جس کے متعلق یہ حضرات بہت کم بحث کرتے ہیں حتیٰ کہ شہادتِ توحید و رسالت کے معانی کی گہرائی میں بھی نہیں جاتے حالانکہ یہی بات اسلام کا اصلِ اصیل ہے۔ اور جو لوگ اَدیان کے اُصول و مبادی پر بحث کرتے ہیں وہ شہادتِ توحید و رسالت، اللہ تعالیٰ (کی ذات و صفات اور اسماء حسنیٰ)، کتبِ منزلہ، یومِ آخرت اور تقدیر (اور ان کے حقائق پر) تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔ (الایمان از ابن تیمیہؒ: ۲۴۴، ۲۴۵) اور جو لوگ معرفت و سلوک کے باب میں کلام کرتے ہیں، وہ مقامِ احسان اور قلبی و داخلی احساسات کی تفصیلات مثلاً خشیتِ الٰہی، محبتِ الٰہی، توکل علی اللہ، اللہ کے فیصلوں یعنی تقدیر پر رضا اور صبر وغیرہ پر گفتگو جو یقیناً ایمان کا موضوع ہیں۔[10] (مختصر معارج القبول شرح سلم الوصول: ۱۸۰)

الغرض یہ حدیثِ جبریلؑ ان تمام اسلامی و شرعی علوم و معارف کی جامع ہے جن پر مختلف علماء اپنے اپنے انداز میں گفتگو کرتے ہیں، ان سب کا مرجع و محور یہی حدیثِ مبارک ہے۔

[زیر نظر مضمون جامع العلوم والحکم کی دوسری حدیث کی شرح کے منتخب ترجمہ پر مبنی ہے جس میں متعدد اقوال و آثار ضعیف ہیں، تفصیل کیلئے محدث لائبریری میں جامع العلوم (محقق) کا مطالعہ کریں۔ ح م]

⑩ اور بعض لوگ اس موضوع کو غلط طور پر 'صوفیت' سے مطعون کرنے لگتے ہیں۔ کہاں بدعی صوفیت اور کہاں شرعاً مطلوب 'احسان' (سعیدی)

اسلامی فلسفہ

زاہد صدیق مغل

دوسرا حصہ

جدید اعتزال کے فکری ابہامات کا جائزہ

اسلام، آزادی، مساوات اور رواداری

① اسلام فرد کی آزادی کا حامی ہے یا انفرادی آزادی کی تقدیس اسلام کا اہم اُصول ہے۔

② اسلام فرد کے اس حق کو مانتا ہے کہ وہ خیر وشر کی جو تعبیر اختیار کرنا چاہے، کرے۔

③ اسلام غیر مسلموں کو مساوی معاشرتی حیثیت دیتا ہے۔

④ اسلام امن ورواداری کا مذہب ہے۔

⑤ قرآنی آیت ﴿لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ سے معلوم ہوا کہ دین میں کسی قسم کا جبر نہیں۔

⑥ اگر مجاہدین کے نظریۂ اسلام (کہ اقامتِ دین فرض ہے) کو تسلیم کرلیا جائے تو مسلمان کہیں بھی مخلوط آبادی میں امن سے زندگی بسر نہیں کرسکتے۔؟؟؟

⑦ زمانۂ حال عالمگیریت (Globalization) کا دور ہے جہاں ہر نظریۂ حیات کے ماننے والوں کے درمیان اشتراکِ عمل کے سوا کوئی دوسری صورت کارگر نہیں۔

⑧ اگر مسلمان بحیثیتِ جماعت اپنے عقائد کی اشاعت کا حق رکھتے ہیں تو اُنہیں غیر مسلموں کو بھی یہ حق دینا ہوگا۔

زیرِنظر مضمون کے اس حصے میں ہم درج بالا جملوں کی تنقیح کرنے کی کوشش کریں گے:

نظریۂ آزادی، مساوات اور رواداری کا مفہوم

جدید مسلم مفکرین قرآنی آیت: ﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (الکہف ۲۹) (تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے) سے ماخوذ شدہ جبر وقدر کی بحث پر مبنی مذہبی تصورِ آزادی کو مغربی تصورِ آزادی سے خلط ملط کرکے اسلام میں آزادی (اور جمہوریت) کا بطور ایک مستقل قدر، اثبات کرتے ہیں، حالانکہ مذہب اور مغرب کے تصور

www.KitaboSunnat.com

آزادی میں سوائے لفظی اشتراک کے اور کوئی شے مشترک نہیں۔ مناسب ہے کہ پہلے ہم مغربی تصوراتِ آزادی، مساوات اور رواداری کے اصل معنی جان لیں، کیونکہ مغربی تہذیب کے یہ تین اہم تصورات باہم ایک دوسرے مربوط ہیں:

نظریۂ آزادی (Principle of Freedom/Autonomy): کا معنی ہے تعیین خیر وشر کا حق (right to define good and bad) یعنی یہ تصور کہ خیر کی تعریف متعین کرنا فرد کا حق ہے ("Good" is the right of individual)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خیر وشر کا تعین کرنے کا حق ہر انسان کو ہونا چاہئے ماورائے اس سے کہ فرد اس حق کو استعمال کر کے اپنے لئے خیر وشر کا کونسا پیمانہ طے کرتا ہے، کیونکہ اصل خیر یہی ہے کہ انسان خود خیر وشر طے کرنے کا مکلّف ومجاز ہو۔ سادہ لفظوں میں یہ کہ خیر وہی ہے جسے فرد اپنی مرضی وارادے سے اختیار کرتا ہے، نیز فرد اپنی ترجیحات کی جو بھی ترتیب مرتب کرے گا وہی اس کے لئے خیر ہوگا۔

اگر ہنری پتے گننے کو اپنی زندگی کا مقصد بنالے تو یہی اس کے لئے خیر ہوگا، اگر ابرار گلوکار بننا چاہتا ہے تو یہی اس کا خیر ہوگا اور اگر عبداللہ مسجد کا امام بننا چاہتا ہے تو یہ اس کا خیر ہوگا۔ الغرض اصل بات یہ نہیں کہ فرد اپنی آزادی کو کس طرح استعمال کرتا ہے بلکہ اصل خیر یہ ہے کہ وہ اپنے لئے خیر وشر طے کرنے کا حق استعمال کرنے میں آزاد ہو۔ دوسرے لفظوں میں آزادی کا مطلب ہے choice of choice (جو چاہنا چاہوں، چاہ سکنے کا حق)، یعنی کوئی عمل فی نفسہٖ اچھا یا برا نہیں اور نہ ہی فرد کے ارادے کے علاوہ کوئی ایسا پیمانہ ہے جس کے ذریعے کسی عمل یا شے کی قدر (value) متعین کی جاسکے بلکہ فرد معیاراتِ خیر وشر کو خود متعین کرتا ہے۔

نظریۂ مساوات (Principle of Equality): یہ ماننا کہ چونکہ ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے قدر (خیر وشر) کا جو پیمانہ چاہے طے کرلے، لہٰذا ہر شخص کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ دوسروں کے اس مساوی حق کو تسلیم کرے کہ وہ بھی اپنی زندگی میں خیر اور شر کا جو پیمانہ چاہیں طے کرلیں اور اس بات کو مانے کہ خیر وشر کے تمام معیارات مساوی

www.KitaboSunnat.com

(Equal) حیثیت رکھتے ہیں۔ مغربی تصورِ مساوات کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کے تعین قدر کی ترتیب کو یکساں اہمیت دی جائے اور کسی بھی فرد کے معیارِ خیر وشر اور اقداری ترجیحات کی ترتیب کو کسی دوسرے کی ترتیب پر فوقیت نہیں دی جانی چاہئے۔ ان معنی میں عبداللہ، ہنری اور ابرار کی خواہشات مساوی اقداری حیثیت کی حامل ہیں اور ان میں کسی ایک کو کسی دوسری پر ترجیح دینے کی کوئی بنیاد موجود نہیں۔ پس خودارادیت (autonomy) کا ہر فرد یکساں مکلّف ہے اور جمہوری ریاست کی تعمیر کے لیے صرف آزادی نہیں بلکہ مساوی آزادی (equal freedom) کو تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔

نظریۂ رواداری (Doctrine of Tolerance): کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی سطح پر اقدار کی ترتیب میں جس فرق کا اظہار لوگوں کی زندگیوں میں ہوتا ہے، اسے برداشت کیا جائے، یعنی یہ مانا جائے کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کی نگاہ میں خیر کا تصور کیا ہے، بلکہ اہم بات یہ ہے کہ فرد اس بات کا قائل ہو کہ ذاتی زندگی میں اقدار کی جو بھی ترتیب ہو مگر معاشرتی سطح پر وہ اس ترتیب کو قبول کرے گا جس میں اُصولِ آزادی (یعنی فرد کے اس حق کو کہ وہ خیر کی جو تعبیر کرنا چاہے، کر سکے) کی بڑھوتری کو مقدم رکھا جائے گا۔ Tolerance کا مطلب اختلافِ رائے کو برداشت کرنا نہیں، بلکہ اس کا مطلب اقداری ترتیب کے فرق کو غیر اہم اور لایعنی سمجھنا ہے۔[1]

چنانچہ آزادی ومساوات بطورِ اقدار اختیار کرنے کا لازمی تقاضا یہ ماننا بھی ہے کہ کسی بھی فرد کو اپنے تصورِ خیر (مثلاً مذہبیت) کی بنیاد پر کسی دوسرے شخص کے عمل پر تنقید کرنے یا اسے

[1] لبرل سیکولرازم عیسائی سیکولرازم سے مختلف شے ہے۔ عیسائیت بھی ایک سیکولرازم قائم کرتی ہے جہاں وہ کہتی ہے کہ بادشاہ کا ایک علاقہ ہے اور پادری کا دوسرا، مگر وہ برداشت کے اس تصور کی بالکل قائل نہیں کہ اقدار کی ذاتی ترتیب غیر اہم ہے۔ اس کے مقابلے میں لبرل سرمایہ دارانہ سیکولرازم کے اندر ذاتی اقداری ترتیب کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں رہتی، اسی لئے اس سیکولرازم کے اندر مذہب کا پنپنا ممکن نہیں رہتا اور نہ ہی یہ مذہب کے معاشرتی وریاستی اظہار کو برداشت کرتی ہے۔ عیسائی سیکولرازم بادشاہ کو ایک محدود دائرہ فراہم کرتی ہے جس کے اندر اس کے اختیار کو تسلیم کیا جاتا تھا مگر بالادست تصوراتِ خیر اور عدل عیسائی تصوراتِ خیر اور عدل ہی تھے۔

www.KitaboSunnat.com

تبدیل کر دینے کی خواہش رکھنے اور اس کے لئے جدوجہد کرنے کا حق حاصل نہیں، یہاں تک کہ ایک باپ کو نماز کے لئے اپنے بچوں پر جبر کرنے کا حق حاصل نہیں ہوسکتا۔[2] اگر فرد مذہبی زندگی کو ایک نفسیاتی دوا یا روحانی تسکین کے ایک ذریعے کے طور پر اپناتا ہے تو یہ قابل قبول ہے مگر مذہب کے معاشرتی و ریاستی اظہار کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ زندگی گزارنے کے تمام طریقوں کو مساوی معاشرتی قدر دینے کے اس رویے کا نام ٹولرنس ہے (جسے عام طور پر اسلامی تصور 'رواداری' سے خلط ملط کر دیا جاتا ہے) جس کا مغربی مفہوم یہ ہے کہ جب تمام افراد کی ذاتی خواہشات کی ترتیب اور زندگی گزارنے کے تمام طریقے مساوی ہیں تو ہر شخص کے لئے لازم ہے کہ وہ دوسرے کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اُنہیں برداشت کرے۔

آزادی کے اُصول پر معاشرتی تشکیل تبھی ممکن ہے جب افراد اظہارِ ذات کے تمام طریقوں کو یکساں اہمیت دیں اور اُنہیں برداشت کرنے کا مادہ پیدا کریں، یعنی ٹولرنس کا مظاہرہ کریں۔[3]

مغربی مباحثِ آزادی اور مساوات سے اخذ شدہ تصورات مثلاً 'ایک سے زائد اچھائیاں' plurality of goods کا ذکر بھی یہاں افادیت سے خالی نہیں، کیونکہ یہ نظریات بھی جدید مفکرین کے لئے فکری اعتزال کا باعث بنے۔ plurality of goods کا مطلب یہ ماننا ہے کہ خیر کی بہت سی تعبیریں ہیں اور یہ تمام تعبیریں اُصولاً و اخلاقاً مساوی ہیں، نیز جمہوری

---

② یہی وجہ ہے کہ جب شہر لاہور میں ہونے والی عورتوں کی حیا باختہ میراتھن ریس کے خلاف دینی تحریکوں اور علماء کرام نے احتجاج کیا تو جدیدیت کے دل دادہ صدر مشرف نے یہ کہا تھا کہ جو میراتھن نہیں دیکھنا چاہتے وہ اپنا ٹی وی بند کرلیں، مگر اُنہیں دوسروں پر تنقید کرنے کا حق حاصل نہیں۔

③ ٹولرنس کے فلسفے کے تحت قائم ہونے والے معاشروں میں کس کس قسم کے اعمال اور اظہار ذات کے کن کن ممکنہ طریقوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ چند ماہ قبل ہونے والے ان دو واقعات سے لگائیں۔ امریکہ میں ایک عورت کو چوبیس گھنٹے میں کئی سو مردوں کے ساتھ 'بدکاری کا عالمی ریکارڈ' بنانے کے 'اعزاز' میں انعام سے نوازا گیا۔ اسی طرح امریکہ میں پانچ ہزار سے زیادہ مردوں اور عورتوں نے مکمل برہنہ حالت میں سڑکوں پر احتجاجی جلوس نکالا۔ یہ ہے ٹولرنس کا اصل مفہوم اور پس پردہ کارفرما جذبہ، العیاذ باللہ من ذٰلک

www.KitaboSunnat.com

ریاست کا بنیادی وظیفہ یہی ہے کہ وہ تمام تصورات خیر کے اظہار کو ممکن بنائے۔ چنانچہ plurality of goods نظریۂ آزادی ومساوات کا منطقی لازمہ ہے۔

۱) اسلام اور آزادی

واضح ہوا کہ مغربی تصوراتِ آزادی و مساوات گویا مستقل اقدار (freedom as value) کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ جمہوری ریاست سے تقاضا کرتی ہیں کہ وہ ایسی معاشرتی وریاستی صف بندی وجود میں لائے جو ہر فرد کی اس صلاحیت وحق کو بڑھاتی چلی جائے کہ وہ جو چاہنا چاہے، چاہ سکے اور اسے حاصل کر سکنے کا مکلّف ہو سکے۔

اس کے مقابلے میں مذہبی نقطہ نگاہ سے آزادی کا مطلب ہے: ارادۂ خداوندی کے مظہر تصوارتِ خیر وشر کو اپنانے کی صلاحیت، یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو جسمانی وعقلی صلاحیتوں سے نوازا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کا انتظام کر دینے کے بعد اسے مجبورِ محض نہیں بنایا بلکہ اسے یہ صلاحیت بھی عطا کی ہے کہ وہ حق کو اختیار کر کے اپنے ربّ کا فرمانبردار بنے یا اس کا انکار کر کے اس کا باغی کہلائے۔ دوسرے لفظوں میں مذہبی جبر وقدر کی بحث میں آزادی کا مفہوم ہے: ''مذہب کے طے کردہ خیر وشر میں سے کسی ایک کو اپنانے کی صلاحیت'' (ability to choose between good and bad) نہ کہ خیر وشر متعین کرنے کا حق (جیسا کہ مغربی تصور ہے)۔ مذہبی تصورِ آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ اگر فرد اپنے ارادے سے کفر اختیار کرے گا تو وہی خیر ہوگا بلکہ اسے اس کی سزا بھگتنا ہوگی جیسا کہ اوپر بیان کردہ پوری آیت پڑھنے سے واضح ہوتا ہے جو یوں ہے:

﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا﴾ (الکہف:۲۹)

''فرما دیجئے کہ حق تو وہی ہے جو تمہارے ربّ کی طرف سے آیا ہے، تو جو چاہے اس حق کو مان لے اور جو چاہے انکار کر دے، البتہ ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے۔''

چنانچہ اسلام آزادی 'بطورِ ذریعہ' (freedom as resource) کا تو قائل ہے کہ

www.KitaboSunnat.com

دیگر مخلوقات کے مقابلے میں انسان کو یہ ذریعہ وصلاحیت حاصل ہے کہ وہ خیر وشر میں سے کسی ایک کو اختیار کرسکتا ہے، جس کا انجام روزِ آخرت اس کو بھگتنا ہوگا، مگر اسلامی نظامِ زندگی میں آزادی بطورِ ایک قدر (freedom as value) کا کوئی مقام نہیں، کیونکہ اصل قدر آزادی استعمال کرنے کا حق نہیں بلکہ اسے اپنے ربّ کے سپرد (surrender) کردینا ہے یعنی قدر آزادی نہیں بلکہ عبدیت ہے۔

مغرب میں آزادی اعلیٰ ترین خیر ہے، کیونکہ ان کے مطابق اصل حیثیت اس چیز کی نہیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں بلکہ اس کی ہے کہ آپ جو چاہنا چاہیں، چاہ سکیں، جبکہ مذہبی نقطہ نگاہ سے اہم بات یہ نہیں کہ میں جو چاہنا چاہوں، چاہ سکنے پر قادر ہوں یا نہیں بلکہ یہ ہے کہ میں وہ چاہتا ہوں یا نہیں جو خدا چاہتا ہے کہ میں چاہوں۔ پس معلوم ہوا کہ نظریۂ آزادی کا معنی عبدیت کا ردّ ہے، یعنی اس بات کا انکار کرنا کہ انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے اور اس کا کام اس کی رضا حاصل کرنا ہے، کیونکہ آزادی کا مطلب انسان کے حق خودارادیت (self-determination) کا دعویٰ ہے۔ یہ تصور دراصل انسان کی بنیادی ضرورت یعنی 'حصول ہدایت کے لئے خدائی رہنمائی' سے انکار پر مبنی ہے۔

۲) اسلام اور مساوات

اسلامی نقطہ نگاہ سے نظریۂ مساوات کا معنی ہے نظامِ ہدایت و رشد کا ردّ، یعنی اس بات کا انکار کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر وشر بتانے کے لئے ہدایت کا کوئی سلسلہ انبیاء کرام کے ذریعے قائم کیا ہے نیز انسان کے پاس ایسی کوئی الہامی اطلاعات نہیں جو حتمی ہوں اور جن کی بنیاد پر وہ خواہشات اور اعمال میں ترجیح کا کوئی پیمانہ قائم کرسکے۔ ایسا اس لئے کہ نظامِ ہدایت کا معنی ہی یہ ہے کہ تمام انسانوں کی خواہشات کی ترتیب ہرگز مساوی معاشرتی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ وہ شخص جس کی خواہشات کی ترتیب تعلیماتِ انبیاء کا مظہر ہیں تو وہ تمام دوسری ترتیبوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظریۂ ریاست آزادی (اور اسی لئے مساوات) کو بطور کسی ایسی معاشرتی قدر قبول نہیں کرتا جو ریاست سے اس بات کا تقاضا کرے کہ وہ خیر کے معاملے 'غیر جانبدار' ہوکر تمام تصوراتِ خیر کے 'حقوق' کا 'مساوی' تحفظ کرے،

www.KitaboSunnat.com

بلکہ اسلامی ریاست کا تو مقصد ہی اس خیر کو جو اِرادۂ خداوندی کی صورت میں نازل ہوا تمام دیگر تصوراتِ خیر (جو درحقیقت شر ہیں) پر غالب کر دینا ہے، نہ کہ ان کے ساتھ مفاہمت کرنا اور خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کر کے اُنہیں مساوی حیثیت عطا کر دینا۔

قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا:

﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ (الفتح: ۲۸)

''وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے۔''

دوسرے لفظوں میں نظامِ ہدایت مساوات کا نہیں بلکہ حفظِ مراتب کا متقاضی ہے جس میں افراد کی درجہ بندی کا معیار (differentiating factor) تقویٰ ہوتا ہے نیز اسلامی معاشرے و ریاست کا مقصد جمہوری معاشرے کی طرح ہر فرد کو اپنی اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گزارنے کے مساوی مواقع فراہم کرنا نہیں بلکہ ان کی خواہشات کو نظامِ ہدایت کے تابع کرنے کا ماحول پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اسی لئے اسلامی نظریۂ ریاست میں citizen (ایسی عوام جو اُصولاً حاکم اور فیصلہ کرنے والی ہو) اور عوامی نمائندگی (Representation of citizens) کا کوئی تصور ہے ہی نہیں، کیونکہ یہاں عوام citizen نہیں بلکہ اللہ کے بندے رمسلمان ہوتے ہیں اور خلیفہ عوام کا نمائندہ نہیں ہوتا کہ جس کا مقصد عوام کی خواہشات کے مطابق فیصلے کرنا ہو بلکہ وہ تو رسول اللہ ﷺ کا سیاسی نائب ہوتا ہے جس کا مقصد مسلمانوں کی خواہشات اور اعمال کو شریعت کے تابع کرنے کے لئے نظامِ ہدایت کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس آزادی و مساوات کا معنی یہ ہے کہ خیر و شر اور اپنی منزل کا تعین انسان خود طے کرے گا اور ہر شخص کا تصور خیر و زندگی گزارنے کا طریقہ مساوی معاشرتی حیثیت رکھتا ہے اور ریاست کا مقصد ایسی معاشرتی صف بندی وجود میں لانا ہوتا ہے جہاں ہر فرد اپنی خواہشات کو ترتیب دینے اور اُنہیں حاصل کرنے کا زیادہ سے زیادہ مکلّف ہوتا چلا جائے۔

www.KitaboSunnat.com

۳) اسلام، رواداری اور امن ☆

اس بحث سے نظریہ رواداری Tolerance کی اسلامی حیثیت بھی واضح ہوجاتی ہے۔ نظریہ رواداری کا معنی ہے نهي عن المنكر کا ردّ، یعنی جب یہ مان لیا کہ خیر کا تعین فرد کا حق ہے، نیز تمام تصوراتِ خیر مساوی ہیں تو یہ ماننا بھی لازم ہے کہ اوّل تو برائی کوئی شے ہی نہیں، اور اگر مجھے کوئی عمل اپنے تصورِ خیر کے مطابق برائی نظر آتا بھی ہے تو میں اسے برداشت کروں نہ یہ کہ اسے روکنے کی فکر اور تدبیر کرنے لگوں۔ بلکہ جمہوری اقدار (آزادی و مساوات) کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں دوسرے شخص کے ہر عمل کو قابل قدر نگاہ سے دیکھوں۔

اگر وہ اپنی ساری زندگی بندروں کے حالات جمع کرنے پر صرف کردے تو کہوں کہ ''واہ جناب کیا ہی عمدہ تحقیقی کام کیا ہے۔'' دوسرے لفظوں میں نظریۂ رواداری اس دعوے کے مترادف ہے کہ وہ تمام احادیث جن میں نهي عن المنكر کا حکم دیا گیا ہے۔④ نیز قرآنی آیات جن میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ

☆ مضمون کا یہ حصہ مولانا مودودیؒ کے مضامین 'رواداری کا غیر اسلامی تصور' (تفہیمات جلد دوم) اور 'اسلام میں مرتد کی سزا' سے ماخوذ ہے۔

④ نهی عن المنکر کے ضمن میں درج ذیل احادیث نظریۂ رواداری کی حقیقت خوب واضح کرتی ہیں:

«من رأىٰ منكم منكرًا فليغيّره بيده فإن لم يستطع فبلسانه فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الايمان» (صحیح مسلم:۴۹) ''تم میں سے جو کوئی بھی برائی دیکھے تو اسے چاہئے کہ اسے اپنے ہاتھ (یعنی طاقت) سے روک دے، اگر اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو اپنی زبان سے ایسا کردے، اگر اس کی استطاعت بھی نہیں رکھتا تو اپنے دل سے ایسا کردے (یعنی تہ دل سے اسے برا جانے اور اس بات کا پختہ تہیہ رکھے کہ جب کبھی زبان اور ہاتھ سے اسے روکنے کی استطاعت آجائے گی تو روک دوں گا)، اور یہ (یعنی دل سے اسے ایسا کرنا) تو ایمان کا سب سے کمزور ترین درجہ ہے۔''

تقریباً یہی بات زیادہ تاکیدی انداز میں آپ ﷺ نے یوں بھی ارشاد فرمائی:

«ما من نبي بعثه الله في أمة قبلي إلا كان له من أمته حواريون وأصحاب يأخذون بسنته ويقتدون بأمره، ثم إنها تخلف من بعدهم خلوف يقولون ما لا يفعلون ويفعلون ما لا يؤمرون، فمن جاهدهم بيده فهو مؤمن، ومن جاهدهم بلسانه فهو مؤمن، ومن جاهدهم بقلبه فهو مؤمن، وليس وراء ذلك من الإيمان حبة خردل» =

www.KitaboSunnat.com

وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم:٦) ''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ'' ان کا انکار کردوں اور اِنہیں نا قابل عمل گردانوں۔

آزادی و مساوات کی مغربی تعبیر کو بطورِ مستقل اسلامی اقدار ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام بھی تمام تصوراتِ خیر کو مساوی حیثیت دیتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کوئی برتر اور مکمل نظام زندگی نہیں بلکہ ایک ایسے برتر نظامہائے زندگی کا حصہ ہے جس میں تمام تصوراتِ خیر برابر ہوتے ہیں اور وہ نظام لبرل سرمایہ داری ہے۔ عالمگیریت (Globalization) کے نام پر مسلمانوں کو موجودہ نظام کے ساتھ اشتراکِ عمل کی دعوت دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس بات سے دستبردار ہوجائیں کہ اسلام ہی حق ہے اور ہم لبرل سرمایہ داری کے آلہ کار بن جائیں کیونکہ موجودہ عالمگیریت کا مطلب لبرل سرمایہ داری کے عالمی غلبے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

ظاہر بات ہے کہ اسلام کے بارے میں یہ تصور درست نہیں، کیونکہ اسلام کا مقصد دنیا کی ہر ریاست (چاہے وہ کیسی ہی ہو) چلانے کے لئے محض پرامن اور وفادار رعیت فراہم کرنا نہیں اور نہ ہی اسلام محض چند عقائد اور اُصول و اَخلاق کا نام ہے جو ہر نظام زندگی میں کھپ سکے کیونکہ اگر معاملہ یہی ہوتا تو اسلام دیگر مذاہب سے کچھ مختلف چیز نہ ہوتا۔ اس کے برخلاف اسلام خود ایک مکمل نظام زندگی اور بھرپور علمیت ہے جس میں عقائد، عبادات، اخلاقیات کے ساتھ ساتھ انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام معاملات سے متعلق احکام وقوانین بھی موجود ہیں۔ پھر اسلام کا اپنے بارے میں دعویٰ یہ نہیں کہ میں بہت سے تصوراتِ حق میں سے ایک

= ''مجھ سے پہلے اللہ نے جس اُمت میں کسی نبی کو مبعوث فرمایا تو اس کی اُمت میں ایسے حواری ہوتے تھے جو اس کی سنت کو مضبوطی سے تھامتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے، پھر ان (حواریوں) کے بعد ان کے ناخلف جانشین آجاتے تھے جو کہتے تھے وہ کرتے نہیں تھے، اور کرتے وہ کام تھے جن کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ تو جو کوئی ایسے (ناخلف) لوگوں سے جہاد کرے گا اپنے ہاتھ سے پس وہ مؤمن ہے، اپنی زبان سے پس وہ مؤمن ہے، اپنے دل سے پس وہ مؤمن ہے، اور اس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔'' (صحیح مسلم) ان احادیث میں واضح طور پر ایسے شخص کے قلب سے ایمان کی نفی فرمائی گئی ہے جو دل سے بھی برائی کو برائی نہ سمجھتا ہو، اسے دیکھ کر اس کے دل میں تکلیف اور رنج نہ ہو اور اسے ختم کردینے کا ارادہ/داعیہ بھی نہ پیدا ہو۔ اسی طرح ایک صحابی نے جب ایمان کی نشانی پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جب نیکی کرنے سے تجھے خوشی ہو اور برائی سے غم ورنج ہو تو تو مؤمن ہے۔'' (صحیح مسلم:٥٠)

www.KitaboSunnat.com

حق ہوں بلکہ وہ خود کو 'الحق' (the truth) کہتا ہے، یعنی وہ پورے یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ صرف میرا ہی نظام برحق ہے اور اسی میں نوع انسانیت کی بھلائی و کامیابی ہے نیز میرے علاوہ سب دعوتیں و نظام تباہی و بربادی کے راستے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا:

﴿ إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللهِ الإِسْلَامُ﴾ (آلِ عمران:۱۹)

''اللہ کے نزدیک دین (یعنی زندگی گزارنے کا معتبر طریقہ) صرف اسلام ہے۔''

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (آلِ عمران:۸۵)

''جو کوئی اسلام کے علاوہ کسی دوسرے طریقے کو اختیار کرے گا تو اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں ہوگا اور آخرت میں وہ ناکام ہوگا۔''

﴿ إِنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهِ ﴾ (الانعام:۱۵۳)

''میرا یہ راستہ ہی سیدھا راستہ ہے پس تم اسی کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو ورنہ تم اللہ کے راستے سے بھٹک جاؤ گے۔''

پس اگر واقعی اسلام کا اپنے بارے میں یہی دعویٰ ہے جو اوپر بیان کیا گیا تو پھر اسلامی نقطہ نگاہ سے نظریہ رواداری Tolerance اور 'ایک سے زیادہ اچھائیاں' plurality of goods کی بات کرنا ہی ایک مہمل بات ہے۔ یہ بات تو ہر معمولی ذہن رکھنے والا شخص بھی سمجھتا ہے کہ دنیا کا کوئی صحیح الدماغ شخص جس شے کو حق اور جسے باطل گردانتا ہے، ان دونوں کو کبھی اپنی زندگی میں مساوی حیثیت نہیں دیتا اور نہ ہی اُنہیں پنپنے کے برابر مواقع فراہم کرتا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مکان تعمیر کرے اور اس میں بجلی کے دو طرح کے کنکشن اور تاریں لگوائے، ایک تو وہ جن کے آگے سوئچ بورڈ اور بٹن لگے ہوں، اور دوسرے اسی دیوار میں کئی مقامات پر بجلی کی تاریں کھلی چھوڑ کر یہ کہتا پھرے کہ میں نے اپنے بچوں کو پوری آزادی دے دی ہے، چاہیں تو سوئچ بورڈ سے پنکھا چلائیں اور اگر چاہیں تو ننگی تاروں کو ہاتھ لگا کر کرنٹ سے مر جائیں۔

www.KitaboSunnat.com

ایسے ہی ایک منزل سے نیچے دوسری میں جانے کے لئے ایک سیڑھی بنا دے، اور اس کے ساتھ بلندی سے گر کر مرنے کے لئے تین راستے بھی کھلے چھوڑ کر یہ کہے کہ میں نے سب راستوں کو برابر حیثیت دے دی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اپنے بچوں کے لئے ایسا مکان بنانے کی ترکیب صرف کسی ذہنی مریض ہی کو سوجھ سکتی ہے ورنہ دنیا کا کوئی بھی شخص چاہے کتنا ہی آزادی کا دل دادہ کیوں نہ ہو ایسی حرکت نہیں کرتا بلکہ مکان بناتے وقت تمام احتیاطی تدابیر (safety-measures) اختیار کرتا ہے تاکہ جس شے (یعنی زندگی کے ہلاک ہو جانے) کو وہ برا سمجھتا ہے، اس کی روک تھام کی جا سکے اور لوگوں کو اس بات کا زیادہ سے زیادہ پابند بنایا جا سکے کہ وہ ایسا طرزِ عمل اختیار کریں جس کے نتیجے میں ان کے ہلاکت میں پڑنے کے امکانات کم از کم اور حصولِ خیر کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہو سکیں۔ پس اس اصول پر اس دعوے کی مضحکہ خیزی بھی جانچی جا سکتی ہے کہ اسلام نظریہ رواداری Tolerance اور plurality of goods کا حامی ہے۔ وہ ایسے کہ ایک طرف تو اسلام پوری قوت کے ساتھ اپنے لئے یہ دعوی کرے کہ صرف میں ہی حق ہوں باقی سب باطل ہیں نیز صرف میرا ہی راستہ حقیقی کامیابی اور نجات کا ضامن ہے باقی سب جہنم و بربادی کے راستے ہیں، لیکن اس کے بعد اس اُصولی دعوے کی مخالفت کرتے ہوئے اپنے معاشرے میں جہنم اور بربادی کی طرف لے جانے والی باقی تمام باطل قوتوں کا راستہ نہ صرف یہ کہ کھلا چھوڑ دے بلکہ ان کے فروغ کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بھی فراہم کرے۔

اگر واقعی اسلام ہی حق ہے تو یہ ماننا بھی ناگزیر ہے کہ اسلام زمین میں اپنے نظام کے علاوہ دوسرے نظاماتِ زندگی کو مغلوب کرنے کا تقاضا بھی کرے۔ یہ بات ہی سراسر مہمل ہے کہ ایک نظامِ زندگی کو باطل بھی کہا جائے اور پھر اس کا غلبہ بھی برداشت کیا جائے۔ وہ صرف ایک فاتر العقل انسان ہی ہو سکتا ہے جو بیک وقت اپنے پیش کردہ نظام کو حق بھی کہے، اس کی پیروی کا حکم بھی دے مگر ساتھ ہی اپنے ماننے والوں کو دوسرے باطل نظامات کے اندر پر امن وفادارانہ زندگی بسر کرنے کی تعلیم بھی دے۔ آخر دنیا میں وہ کون شخص ہے جو جس شے کو شر سمجھتا

www.KitaboSunnat.com

ہے، پھر اسے پھیلنے کی مکمل آزادی اور حق بھی دے دے؟ ایسی بے وقوفی کی اُمید تو ایک عام انسان سے بھی نہیں کی جاسکتی چہ جائیکہ اس کی نسبت اللہ اور اس کے رسول کی طرف کرنے کی جسارت کی جائے۔

اسلام کا خود کو حق کہنا اور اس کی طرف پوری قوت سے دعوت دینا اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ دوسرے نظامات کو ہٹا کر ان کی جگہ اپنا نظامِ اقتدار قائم کرنے کا مطالبہ کرے اور اپنے ماننے والوں کا طرۂ امتیاز اسی کو قرار دے کہ آیا وہ اس جدوجہد میں جان و مال کھپاتے ہیں یا نہیں۔ اس معاملے میں یہ سوال ہی غیر اہم ہے کہ کفار ہماری اس جدوجہد کو برداشت کریں گے یا نہیں یا ہمیں غیر مسلموں کا تعاون حاصل ہوگا یا نہیں؟

اسلام کی اس اُصولی پوزیشن سے یہ نتیجہ خود بخود نکلتا ہے کہ حقیقی مسلمان کا وجود ہر غیر اسلامی ریاست کے لئے کھلا چیلنج ہی ہونا چاہئے، کیونکہ کوئی اسے برداشت کرے یا نہ کرے بہرحال اسلام کا تقاضا اپنے ماننے والوں سے یہی ہے کہ جہاں کہیں خدا کا قانون نافذ نہیں ہے اور ظلم وستم کا دور دورہ ہے، وہاں ظلم وستم کا خاتمہ کرکے ایسے حالات پیدا کردیں کہ غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی آزادی میسر آجائے۔

بلاشک وشبہ اسلام امن وسلامتی کا حامی ہے مگر اس کی نگاہ میں حقیقی امن اور سلامتی وہی ہے جو نفاذِ شریعت سے حاصل ہوتی ہے۔ جو کوئی اسلام میں امن وسلامتی کا مطلب یہ سمجھا کہ شیطانی وطاغوتی نظاموں کے زیرسایہ سارے کاروبارِ زندگی پورے اطمینان سے چلتے رہیں اور مسلمان کو خراش بھی نہ آئے، وہ اسلام کا نقطہ نظر بالکل نہیں سمجھا⑤ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے

---

⑤ جن مسلم مفکرین (مثلاً وحیدالدین خان) کے خیال میں 'ہر حال میں قیام امن' اسلام کا اوّلین اُصول ہے وہ سرمایہ داری کو بطور ایک معاشرتی و ریاستی عمل اور ایک علمیت نہیں پہچانتے۔ ان مفکرین کے خیال میں حالت 'امن' گویا کسی نیوٹرل مقام کا نام ہے حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں، کیونکہ اصل سوال یہ ہے کہ 'امن کس اُصول کی بالادستی و غلبے پر قائم ہوا ہے؟'' ۔ یہ مفکرین اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے کہ اگر واقعی ہر حال میں امن اسلام کا اوّلین اصول ہے تو حضور ﷺ نے مشرکین مکہ کی درخواست کے باوجود صلح حدیبیہ کو کالعدم قرار دے کر مکہ پر حملہ کیوں کیا تھا؟

www.KitaboSunnat.com

کہ اسلام کو کفر و طاغوت کا قائم کردہ امن نہیں بلکہ اپنا قائم کردہ امن مطلوب ہے اور اسی میں وہ انسان کی سلامتی دیکھتا ہے۔[1]

کفر و طاغوت کی بالادستی پر مبنی قیام امن کا مطلب صرف یہ ہے کہ نوع انسانیت اطمینان و سکون کے ساتھ جہنم کے راستے پر چلنے پر راضی ہوجائے اور مسلمان ٹس سے مس نہ ہوں۔ ظاہر ہے قیامِ امن کا یہ تصور اس مقصد ہی کے خلاف ہے جسکے لئے اُمتِ مسلمہ برپا کی گئی ہے جیسا کہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا:

---

[1] مغرب کا یہ دعویٰ کہ لبرل سیکولر ریاست خیر کے معاملے میں غیر جانبدار اور اسی لئے Tolerant ہوتی ہے، ایک جھوٹا دعویٰ ہے، کیونکہ خیر کے معاملے میں غیر جانبداری کا رویہ ممکن ہی نہیں (اس نقطے پر ذرا تفصیلی گفتگو 'اسلام اور ہیومن رائٹس' کی بحث میں ہوگی)۔ مختصراً یہ کہ لبرل جمہوری ریاست بھی ایک مخصوص تصورِ خیر کو تمام دیگر تصوراتِ خیر پر بالاتر کرنے کی ہی کوشش کرتی ہے اور وہ تصورِ خیر 'آزادی' ہے، یعنی یہ تصور کہ تمام تصوراتِ خیر مساوی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا کہ تمام تصوراتِ خیر مساوی ہیں غیر جانبداری کا رویہ نہیں بلکہ بذاتِ خود خیر کا ایک مستقل مابعد الطبعیاتی تصور ہے کہ 'اصل خیر تمام تصوراتِ خیر کا مساوی ہونا ہے۔' اور اسی تصورِ خیر کے تحفظ اور فروغ کی لبرل جمہوری دستوری ریاست پابند ہوتی ہے۔ یہ سمجھنا کہ لبرل جمہوری ریاست کوئی tolerant ریاست ہوتی ہے، ایک فریب ہے، کیونکہ اپنے دائرۂ عمل میں یہ صرف اُنہیں تصورات خیر کو برداشت کرتی ہے جو اس کے اپنے تصورِ خیر (یعنی تمام تصوراتِ خیر کی مساوات و لایعنیت) سے متصادم نہ ہو، اور ایسے تمام تصوراتِ خیر جو کسی ایک چاہت کو بقیہ تمام چاہتوں سے بالاتر سمجھ کر اس کی برتری کے قائل ہوں، ان کی بذریعہ قوت بیخ کنی کر دیتی ہے جس کی مثال طالبان کی حکومت پر بمباری سے عین واضح ہے۔ درحقیقت خیر کے معاملے میں لبرل جمہوری ریاست بھی اتنی ہی dogmatic (راسخ العقیدہ) اور intolerant (ناروادار) ہوتی ہے جتنی کوئی مذہبی ریاست، کیونکہ دونوں ہی اپنے تصوراتِ خیر سے متصادم کسی نظریئے کی بالادستی کو روا نہیں رکھتیں۔ خوب یاد رہے کہ تمام تصوراتِ خیر کی لایعنیت کا مطلب غیر جانبداری نہیں بلکہ مساوی آزادی (سرمائے کی بالادستی) بطورِ اصل خیر کا اقرار ہے۔ یہ اسی کا مظہر ہے کہ پختہ (matured) جمہوری ریاستوں میں ارادۂ انسانی یعنی اس کے حق کی بالادستی تمام دیگر تصوراتِ خیر پر غالب آجاتی ہے اور کسی مخصوص خیر کی دعوت دینا ایک لایعنی اور مہمل دعوت بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسی ریاستوں میں آپ کسی مخصوص خیر (مثلاً مذہبیت) کے اظہار کو 'بطور ایک حق' کے پریکٹس (Practice) تو کر سکتے ہیں مگر اسے دیگر تمام تصوراتِ خیر اور زندگی گزارنے کے دوسرے طریقوں پر غالب کرنے کی بات نہیں کر سکتے کہ ایسا کرنا ہیومن رائٹس کی خلاف ورزی ہے۔

www.KitaboSunnat.com

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

''تم دنیا میں وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کی ہدایت کیلئے برپا کی گئی ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو۔''

دین میں جبر نہیں!

قرآنی آیت ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ ''دین میں کوئی زبردستی نہیں'' (البقرۃ: ۲۵۶) کو بھی اس کے عمومی معنی کی آڑ میں اسلام میں آزادی و رواداری کے جواز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کا اصل مفہوم بھی قریب قریب وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا جیسا کہ مکمل آیت پڑھنے سے عین واضح ہوجاتا ہے۔ اس آیت کو یہ عمومی معنی پہنانا کہ دین کے کسی معاملے میں کوئی جبر ہے ہی نہیں، آیت کی بالکل غلط تعبیر ہے، کیونکہ اس تشریح کے بعد اسلام کے تمام معاشرتی و سیاسی احکامات کالعدم ہو جائیں گے۔ مثلاً اسلامی ریاست میں کوئی شخص چوری کرے اور جب ہاتھ کٹنے کی باری آئے تو کہہ دے: ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ اسی طرح اس آیت سے تمام تصوراتِ زندگی کی اخلاقی و معاشرتی مساوات (plurality of goods) کا اُصول نکالنا بھی سراسر غلط ہے، کیونکہ اگر آیت کو پورا پڑھ لیا جائے تو اس نظریئے کی تردید ہوجاتی ہے۔ مکمل آیت کا ترجمہ یہ ہے:

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (البقرۃ: ۲۵۶، ۲۵۷)

''دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں، بے شک ہدایت گمراہی سے خوب واضح ہوگئی ہے، پس جو کوئی طاغوت (بندگی کا انکار کرنے والے) کا انکار کرکے اللہ پر ایمان لے آیا تو اس نے ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے اور جاننے والا

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ اللہ مددگار رہے ایمان والوں کا وہ اُنہیں (جہالت کی) تاریکیوں سے (ہدایت کی) روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے۔ اور جنہوں نے (ہدایت کا) انکار کیا ان کے ساتھی طاغوت ہیں جو اُنہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں، یہی لوگ آگ میں جانے والے ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

قرآن نے ہدایت و خیر کے لئے لفظ 'نور' مفرد اور گمراہی کے لئے 'ظلمات' جمع استعمال کرکے یہ بتا دیا کہ حق اور خیر درحقیقت صرف ایک ہی ہے جبکہ جہالت کی کئی شکلیں ہیں۔ خوب یاد رہے کہ ارادۂ خداوندی سے باہر یا اس سے ماورائے کسی حق اور خیر کا کوئی وجود ہے ہی نہیں، خیر اور حق وہی ہے جسے اسلام خیر اور حق کہتا ہے نیز اسلامی نظام زندگی میں ارادۂ خداوندی سے متصادم تصورات ہرگز بھی مساوی معاشرتی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ اُنہیں لازماً وہی پوزیشن اختیار کرنا ہوتی ہے جس کے لئے قرآن صَاغِرُوْنَ حالتِ مغلوبیت (التوبہ: ۲۹) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

قرآنی آیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام اپنے عقائد کسی سے زبردستی نہیں منواتا کہ یہ بذریعہ قوت منوانے کی چیز نہیں۔ اسلام اپنے نظامِ عمل میں ذاتی عقائد اور عبادات اختیار کرنے کی آزادی دینے پر تو تیار ہے مگر وہ اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کرتا کہ اللہ کے قوانین معاشرت و ریاست کے سوا کسی اور کے بنائے ہوئے قوانین کی عمل داری مخلوقِ خدا پر قائم و دائم ہو اور اللہ کی زمین پر اس کے باغیوں کا غلبہ ہو نیز مسلمان ان کے تابع ہو کر اطمینان سے زندگی بسر کریں۔

اجتماعی زندگی کے اس معاملے میں لامحالہ ایک فریق کو دوسرے فریق کے 'دین' میں مداخلت کرنا ہی ہوگی۔ اگر مسلمان 'مذہبِ کفر' میں دخیل نہیں ہوں گے، تو کافر 'مذہب اسلام' میں مداخلت کرکے رہیں گے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی زندگی کے بہت بڑے حصے پر مذہب کفر جاری و ساری ہوگا، جیسا کہ موجودہ حالات میں عین واضح ہے کہ کفر اپنی پوری قوت کے ساتھ اسلام پر حملہ آور ہے۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ یہ مداخلت کفار کی طرف سے ہو اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اللہ کی مخلوق پر اہل کفر کے ظلم و ستم کا خاتمہ کریں اور پھر جہاں تک

www.KitaboSunnat.com

ذاتی مذہبی عقائد وعبادات کا تعلق ہے تو غیر مسلموں کے ساتھ لا اِکراہ في الدین کا معاملہ کیا جائے کہ کسی غیر مسلم پر اسلام قبول کرنے میں جبر روا نہیں رکھا جائے گا۔ یہی درست اسلامی تصورِ رواداری ہے کہ اسلام کے بجائے کفر حالتِ مغلوبیت کا شکار ہو۔ دوسروں کو ان کے مسلک پر چلنے دینا بے شک رواداری ہے مگر یہ کوئی رواداری نہیں کہ اپنے طریقۂ حیات کے خلاف اپنے اوپر دوسروں کا طریقہ مسلط کرلیا جائے۔

اِسی طرح بعض جدید مفکرین نے قرآنی آیت: ﴿فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ (الغاشیہ: ۲۱،۲۲) ''اے نبی ﷺ! آپ نصیحت کرتے رہئے کہ آپ تو نصیحت ہی کرنے والے ہیں، ان پر جبر کرنے والے نہیں۔'' سے یہ مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی کہ علماے دین کا کام محض دعوت دینا ہے نہ کہ غلبہ دین کے لئے کوئی منظم حکمت عملی اختیار کرنا اور اجتماعی صف بندی وغیرہ کرنا۔ آیت کی یہ تشریح کسی ایک قرآنی آیت کو قرآن کی عمومی تعلیمات سے ہٹا کر معنی نکالنے کی عمدہ مثال ہے۔ آیت کا سیدھا سا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص معقول دلائل اور نصیحت کے بعد بھی حق کو قبول نہیں کرتا، اسے زبردستی حق قبول نہیں کروایا جائے گا۔ ویسے بھی رحمۃ للعالمین ﷺ کے قلبِ مبارک پر کفار کا انکارِ اسلام بہت ہی شاق گزرتا اور آپ اس رنج میں مبتلا رہتے کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے، تو آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیبِ کریم ﷺ کی تسلی کے لئے فرما رہا ہے کہ اے حبیب! آپ فکر مت کیجئے، ان کے ایمان قبول نہ کرنے کی کوئی ذمہ داری آپ پر نہیں، کیونکہ آپ ان پر بطور داروغہ مسلط نہیں کئے گئے کہ اُنہیں ایمان قبول کروانا آپ کے فرائض نبوت میں شامل ہو۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ آیت مکی دور سے متعلق ہے جہاں مسلمانوں کو عملاً سیاسی غلبہ حاصل نہ ہوا تھا، اس کے مقابلے میں مدنی آیتوں میں واضح طور پر اقامتِ دین کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآنی آیات کے معنی کو درست طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ مکی اور مدنی آیات کو ملا کر پڑھا جائے تاکہ آیات کے عموم اور خصوص کا درست اطلاق معلوم ہو سکے۔ اگر یہ اُصول مان لیا جائے کہ دین محض نصیحت ہی کا نام ہے تو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ بے شمار

www.KitaboSunnat.com

معاشرتی و ریاستی احکامات ہمیشہ طاقِ نسیاں میں ہی پڑے رہیں گے۔

اسلام اور تبلیغ کفر کی اجازت

یہیں سے یہ نکتہ بھی صاف ہوجاتا ہے کہ اسلام اپنی دائرہ عمل میں تبلیغ کفر کی اجازت کیوں نہیں دیتا۔ کسی شخص کا خود اپنی ذاتی زندگی میں ایک عقیدے کو ماننا اور بات ہے اور اس کا اپنے نظریات کے مطابق اجتماعی زندگی کی تعمیر کی دعوت دینا نیز اس کے مطابق نظام زندگی بنانا اور اسے بذریعہ قوت خلق خدا پر نافذ کرنا ایک دوسری چیز ہے۔ حق تو یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے باغی ہوں اُنہیں خدا کی زمین میں بسنے کا حق بھی نہ ہونا چاہئے مگر یہ اللہ تعالیٰ کا انتہائی حلم ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو نہ صرف یہ کہ جینے کی مہلت دیتا ہے بلکہ اُنہیں اپنی ذاتی زندگی میں کفر پر قائم رہنے کا اختیار بھی دیتا ہے جب تک کہ ان کی بغاوت دوسرے بندگانِ خدا کے لئے فتنہ وفساد کا باعث نہ بن جائے۔ اپنے اُصولی دعوے کے بعد اسلام کے لئے یہ بات پسند کرنا تو درکنار قبول کرنا بھی مشکل ہے کہ بنی نوع انسانی کے اندر وہ دعوتیں پھیلیں جو اسے ابدی ہلاکت کی طرف لے جانے والی ہوں۔ وہ داعیانِ باطل کو یہ رعایت دینے کا متحمل نہیں ہوسکتا کہ جس آگ کے گڑھے کی طرف وہ خود جارہے ہیں، دوسروں کو بھی اس کی طرف کھینچ کر لے جائیں۔ زیادہ سے زیادہ جس چیز کو وہ بادلِ ناخواستہ قبول کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ جو شخص خود کفر کے راستے پر قائم رہنا چاہتا ہے، اسے اختیار ہے کہ اپنی فلاح کے راستے کو چھوڑ کر بربادی کے راستے پر چلتا رہے۔ انسانیت کی خیرخواہی اور عدل کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر بالجبر لوگوں کو کفر کے زہر سے بچانا ممکن ہوتا تو اسلام ہر شخص کا ہاتھ پکڑ کر اسے یہ زہر پینے سے روک دیتا مگر ایمان ایسی شے نہیں جو بذریعہ قوت کسی کے دل میں ڈال دی جائے۔ فرد کی اس جبری حفاظت سے اسلام کے اجتناب کی وجہ یہ نہیں کہ اسلام کفر اور جہنم کی طرف جانے کو فرد کا 'حق' سمجھتا ہے اور انہیں روکنے کو 'باطل' گردانتا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کفر کے تباہ کن نتائج سے اس وقت تک بچایا نہیں جاسکتا جب تک وہ خود کفر کے نقصانات کا معترف ہوکر مسلمان نہ ہوجائے۔ اس لئے اسلام کہتا ہے کہ کفار کو دین حق پر ایمان لانے کے لئے مجبور تو نہ کرو، لیکن

www.KitaboSunnat.com

غلبہ کفر کے فتنے کو پوری قوت سے مٹانے کی کوشش کرو اور جو لوگ میرے دین کو نہیں مانتے وہ چھوٹے ہو کر زندگی بسر کریں۔

کوئی فرد اگر اپنی انفرادی زندگی میں کفر اختیار کرنا چاہتا ہے تو کرے مگر اسے یہ حق نہیں کہ وہ بندگانِ خدا پر باطل نظامِ اِکراہ مسلط کر کے اُنہیں جہنم کی طرف گھسیٹ کر لے جائے، اس سے بہتر یہ ہے کہ مسلمان ان پر اِکراہ کریں اور اُنھیں اس مقام پر لا کھڑا کریں جہاں اگر وہ چاہیں تو بآسانی جنت کا راستہ تلاش کر سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام اس قیمت پر حق کی اشاعت کی دعوت خریدنا نہیں چاہتا کہ اس کے جواب میں اسے جھوٹ کی دعوت دینے کی آزادی دینی پڑے۔ وہ اپنے ماننے والوں سے کہتا ہے کہ اگر تم سچے دل سے مجھے حق سمجھتے ہو اور نوعِ انسانیت کی بھلائی میری پیروی میں دیکھتے ہو تو دنیا کو میری طرف دعوت دو اور مجھے قائم کرنے کی جدوجہد کرو، خواہ اس کام میں تمہیں گلزارِ ابراہیمی کا سامنا کرنا پڑے یا آتشِ نمرود کا۔ یہ تمہارے ایمان کا تقاضا ہے کہ تم اس امتحان میں کامیاب ہوتے ہو یا نہیں، لیکن میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ تمہیں راہِ حق کی خطرناکیوں سے بچانے کے لئے باطل پرستوں کو یہ 'حق' دے دوں کہ وہ خدا کے بندوں کو گمراہ کریں اور اُنہیں جہنم کے راستوں کی طرف ہانک لے جائیں۔

پھر کفر کی ،،دعوت وتبلیغ دو میں سے کسی ایک حال سے خالی نہیں، یا تو وہ سیاسی نوعیت کی دعوت ہوگی اور یا پھر اخلاقی۔ اگر وہ دعوت سیاسی نوعیت کی ہو اور اس کا مقصد نظامِ زندگی میں تغیر ہے تو جس طرح دنیا کی ہر ریاست ایسی دعوت کی مزاحمت کرتی ہے، اسی طرح اسلام بھی اس کی مخالفت کرتا ہے۔ اگر وہ دعوت محض مذہبی و اخلاقی نوعیت کی ہے تو دنیاوی ریاستوں کے برخلاف اسلام اس کی اجازت بھی نہیں دے سکتا، کیونکہ کسی اخلاقی و اعتقادی گمراہی کو اپنی نگرانی وحفاظت میں سر اُٹھانے کا موقع دینا اس مقصد ہی کی ضد ہے جس کے لئے اسلام زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔

دنیاوی ریاستوں کو چونکہ فرد کی اُخروی کامیابی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا لہٰذا وہ اعتقادی گمراہی کا سد باب کرنے کی فکر نہیں کرتیں۔ البتہ جس اخلاقی قدر پر ان کی ریاست کا نظام

www.KitaboSunnat.com

قائم و دائم ہو (مثلاً سچ بولنا، ریاست سے وفاداری وغیرہ) تو اس کے خلاف دعوت دینے والوں کو وہ بھی بذریعہ قوت روک دیتی ہیں۔ اسلام کے نزدیک انسان کا سنگین ترین مسئلہ بیماری یا غربت نہیں بلکہ اپنے ربّ کا انکار اور اس سے سرکشی و بغاوت (فسق، کفر، شرک، طاغوت) ہے اور بغاوت کا فروغ کبھی بطورِ پالیسی اختیار نہیں کیا جاتا۔

اس رویے کی وضاحت اس مثال سے کی جاسکتی ہے کہ جب کبھی یہ کہا جائے کہ ٹی وی بے حیائی اور فحاشی کو فروغ دے رہا ہے تو یہ عجیب وغریب فلسفہ سننے کو ملتا ہے کہ ''جناب ٹی وی پر تو مذہبی چینلز بھی آتے ہیں، تو جو چاہے فلموں اور گانوں کے بجائے ان چینلز کو دیکھ لے۔'' اس فلسفے کا بودا پن اوپر بیان کی گئی تفصیلات سے واضح ہو جانا چاہئے۔ اس مثال میں اصل سوال یہ نہیں کہ آیا ٹی وی پر مذہبی پروگرام آتے ہیں یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اگر فحاشی وعریانی پھیلانا برائی اور جرم ہے تو اس کے فروغ کو بطورِ ایک 'حق' اور 'پالیسی' کیسے اختیار کرلیا جائے؟ اس دلیل کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم افیون اور چرس بیچنے والے کو بھی اپنے کاروبار کے فروغ کی کھلی چھٹی دے دیں، کیونکہ وہ بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ جناب بازار میں کھانے کی بے شمار اشیا موجود ہیں، لوگ چاہیں تو میری چرس کے بجائے انہیں استعمال کرلیں۔ پس یاد رکھنا چاہئے کہ

☆ مادر پدر آزادی ردّ ہے عبدیت کا

☆ مساوات ردّ ہے نظامِ ہدایت وتزکیۂ نفس کا

☆ عیش وآرائش کے لئے ترقی ردّ ہے دنیا کے دارالامتحان ہونے اور معرفتِ خداوندی کے امکان کا

☆ انسانیت ردّ ہے مسلمانیت کا

☆ Plurality of goods ردّ ہے اسلام کے الحق ہونے کا

☆ Tolerance ردّ ہے ایمان اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا

ہمیں چاہئے کہ ہم چیزوں کی حقیقت کا علم حاصل کریں تاکہ آزادی، مساوات، Tolerance اور plurality of goods جیسے گمراہ کن تصورات کی نسبت اللہ اور اس کے رسول کی طرف کرنے سے بچ سکیں۔

www.KitaboSunnat.com

عالمی سیاست اور اسلام

ابوالوفاء محمد طارق عادل خان

صدرِ امریکہ باراک اوباما ہی کیوں؟

زیرِ نظر مضمون مربوط خدشات سے بھرپور اگرچہ منفی نقطہ نظر کا حامل ہے تاہم مسلمانوں کے موجودہ حالات کے تناظر میں اسے بالکل نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور اوبامہ کے بارے میں مسلمانوں میں پائی جانے والی خوش فہمی کا ایک دوسرا رخ ہے۔ اس مضمون میں بیان کردہ استدلال کی تائید جہاں پاکستان کے موجودہ سنگین ترین حالات سے ہوتی ہے، وہاں باراک اوباما کا حالیہ بیان کہ ''پاکستان کی سول حکومت ناکام ہوچکی ہے۔'' اسی مضمون میں بیان کردہ مخصوص طرزِ فکر کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ح م

امریکہ کے نئے صدر باراک اوباما ۱۹۶۱ء میں امریکی ریاست ہوائی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا تعلق کینیا سے جبکہ والدہ کا تعلق ہوائی سے ہے۔ والدین میں ملاقات دورانِ طالب علمی، ہوائی یونیورسٹی میں ہوئی جہاں ان کے والد اسکالرشپ پر پڑھنے آئے ہوئے تھے۔ اس ملاقات کا نتیجہ شادی کی صورت میں برآمد ہوا، لیکن یہ شادی زیادہ عرصہ نہ چل سکی اور اس کا انجام طلاق پر ہوا۔ پھر والدین کی علیحدگی اور طلاق کے بعد اوباما اپنی والدہ کے ساتھ امریکہ اور کچھ عرصہ کے لئے انڈونیشیا میں رہے، کیونکہ ان کا سوتیلا باپ بھی مسلمان تھا اور اس کا تعلق انڈونیشیا سے تھا۔ غالباً اسی دور میں باراک اوباما کسی اسلامی دینی مدرسہ میں بھی کچھ عرصہ زیرِ تعلیم رہے تھے۔

باراک اوباما نے کولمبیا یونیورسٹی اور ہارورڈ یونیورسٹی لاء سکول سے تعلیم حاصل کی اور ہارورڈ یونیورسٹی میں 'ہارورڈ لا ریویو' کے پہلے سیاہ فام امریکی صدر بنے۔ اُنہوں نے شکاگو میں پہلے سماجی پروگرام میں اور پھر بطور وکیل کام کیا۔ وہ آٹھ سال تک ریاست الینوائے کی سیاست میں سرگرم رہے اور ۲۰۰۴ء میں وہ امریکی سینٹ کے لئے منتخب ہوئے۔ اس کے بعد باراک اوباما نے فروری ۲۰۰۷ء میں امریکی صدارتی نامزدگی کی دوڑ میں شامل ہونے کا اعلان کیا اور بالآخر طویل جدوجہد اور مقابلہ کے بعد امریکہ کے صدر منتخب ہونے میں کامیاب ہوئے۔

باراک حسین اوباما کی امریکی صدارت حاصل کرنے میں کامیابی کے متعدد اَسباب بیان

کئے جاتے ہیں جن میں ان کا افریقی النسل ہونا جس کے نتیجہ میں تمام سیاہ فام ووٹ اوباما کو ملے۔ مسلمان باپ کی اولاد ہونا جس کے باعث مسلمان ووٹرز کا قدرتی میلان اوباما کی طرف ہوا اور اس کے علاوہ امریکی عوام کی گذشتہ صدر بش کی خارجہ پالیسی سے شدید اختلاف وغیرہ، لیکن ہمارے نزدیک اس کا اہم ترین سبب یہ ہے کہ وہ یہودی منصوبہ جس کا آغاز نیویارک کے عالمی تجارتی مرکز کی عمارتوں کی تباہی سے ہوا تھا، اس کی تکمیل کے لئے باراک اوباما ہی موزوں ترین امیدوار ہے۔ یہی سبب ہے کہ امریکی انتخابات سے محض چند روز قبل باراک اوباما پر قاتلانہ حملہ کے منصوبہ کا ڈرامہ بھی رچایا گیا تاکہ انتخابات میں زیادہ سے زیادہ ووٹرز کی ہمدردیاں باراک اوباما کو حاصل ہوسکیں، لیکن اس سے قبل کہ ہم یہ راز طشت ازبام کریں کہ وہ یہودی منصوبہ کیا ہے اور اس منصوبے میں یہودی اوباما کا کیا استعمال کرنا چاہتے ہیں، ہم چاہیں گے کہ باراک اوباما کے اپنے اقوال کی روشنی میں اس کے مذہبی رجحان اور اس کی ترجیحات کا تعین کریں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے صدارتی الیکشن کی مہم کے دوران باراک اوباما کے حوالے سے جاری ہونے والا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے، اخبار لکھتا ہے کہ

”امریکہ کا صدارتی امیدوار بننے کے لئے کوشاں ڈیموکریٹ بارک اوباما نے آخری وقت میں ووٹروں کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے اس دعویٰ کو مسترد کردیا ہے کہ وہ خفیہ طور پر مسلمان ہیں۔ اوباما نے انٹرنیٹ پر اس مہم کی مذمت کی ہے۔ اگرچہ اس کا دوسرا نام حسین ہے، لیکن وہ ایک عیسائی ہے اور جتنا ممکن ہو، چرچ جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ اس کے خلاف مہم ہیلری کلنٹن کے حامیوں نے شروع کر رکھی ہے۔ حالانکہ اس بات کا ہیلری کو بھی یقین ہے کہ وہ عیسائی ہیں۔“

(بحوالہ ’جنگ نیوز‘ کراچی: ۵/مارچ ۲۰۰۸ء)

پس جو مسلمان باراک اوباما کے نام میں شامل لفظ 'حسین' سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں انہیں جان لینا چاہیے کہ باراک اوباما کو کوئی ہمدردی اور تعلق مسلمانوں کے ساتھ نہیں ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اوباما عیسائیوں کے ساتھ ہے؟ جی نہیں بلکہ اوباما کی تمام تر ہمدردیاں اور وفاداریاں عیسائیوں کے ساتھ بھی نہیں بلکہ یہودیوں کے ساتھ ہیں۔ اس کا ثبوت باراک اوباما کا مندرجہ ذیل پالیسی بیان ہے:

”باراک اوباما نے گذشتہ رات اپنی جماعت کی طرف سے صدارتی نامزدگی میں کامیابی کے دعوے کے بعد اپنی پہلی پالیسی تقریر میں اسرائیل کے لئے غیر متزلزل حمایت کا وعدہ کیا ہے۔

اوباما نے امریکہ اسرائیل پبلک افیرز کمیٹی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ہے کہ اسرائیل کی سلامتی مقدس ہے اور اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا، یہ کمیٹی یہودیوں کی ایک ممتاز لابی کہلاتی ہے۔'' (بی بی سی اُردو ویب سائٹ: ۴؍جون ۲۰۰۸ء)

باراک اوباما کا مذکورہ بالا یہ بیان صدراتی الیکشن کی کسی تقریر کا حصہ نہیں جسے محض ووٹرز کو متوجہ کرنے کی کوشش کہہ کر ٹالا جا سکے بلکہ یہ 'پہلی پالیسی تقریر' کا ایک حصہ ہے یعنی صدرِ امریکہ کی ایک متعین خارجہ پالیسی کا اظہار اور عزم اور ایک مستند رخ ہے۔ اب اسی کے ساتھ صدرِ امریکہ کی خارجہ پالیسی کا ایک دوسرا رخ بھی ہم قارئین کے سامنے لانا چاہتے ہیں، اس ضمن میں یہ خبر ملاحظہ ہو:

''نومنتخب امریکی صدر باراک اوباما کی طویل انتخابی مہم کے دوران جب بھی خارجہ پالیسی کی بات ہوئی تو عراق اور افغانستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کا نام بھی آتا رہا۔

ان پر پاکستان کے قبائلی علاقوں میں القاعدہ کے خلاف براہِ راست کاروائی کے لئے فوج بھیجنے کے بیان پر تنقید بھی ہوئی، لیکن اوباما آخر تک پاکستان میں براہِ راست کاروائی کے اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔

صدر منتخب ہونے کی صورت میں پاکستان سے متعلق اپنے لائحہ عمل کی وضاحت اپنی ویب سائٹ پر کرتے ہوئے اوباما کہتے ہیں کہ اصل میدانِ جنگ افغانستان اور پاکستان ہیں۔''

(بی بی سی اُردو ویب سائٹ: ۵؍نومبر ۲۰۰۸)

پس نیو ورلڈ آرڈر یعنی تسخیر عالم کے یہودی منصوبہ میں اس وقت باراک اوباما کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے، اس لئے موجودہ امریکی صدر باراک اوباما نے اپنے اوپر اسرائیل کی حفاظت اور پاکستان کی بربادی کو واجب کرلیا ہے، کیونکہ بقول باراک اوباما پاکستان میدان جنگ ہے اور میدانِ جنگ وہ جگہ ہوتی ہے، جہاں ہر چیز حالتِ جنگ میں ہوتی ہے۔ نیز میدانِ جنگ میں جان و مال کی بربادی ہونا بھی ایک یقینی بات ہے۔ جیسا کہ افغانستان اور عراق کا میدانِ جنگ بننے کے بعد جو حال ہوا، تمام لوگ اس سے بخوبی واقف ہیں۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ امریکہ کی یہودی لابی پاکستان کو میدانِ جنگ بنانا چاہتی ہے، اس ضمن میں صاف ظاہر ہے کہ اسرائیل کی توسیع پسندانہ عزائم یعنی گریٹر

اسرائیل اور مسجد اقصیٰ کے انہدام کی صورت میں اگر کسی اسلامی ملک کی طرف سے کوئی عسکری مزاحمت ہوسکتی ہے تو وہ صرف پاکستان ہوگا، کیونکہ پاکستان کے پاس اعلیٰ تربیت یافتہ فوج، ایٹمی اسلحہ اور میزائل ٹیکنالوجی کی جو صلاحیت ہے، وہ کسی دوسرے اسلامی ملک کے پاس نہیں ہے۔ مزید برآں امریکہ کی اس تمام مہم جوئی کی اصل وجہ صرف یہی نہیں کہ وہ اسرائیل کو توسیع کی کھلی چھٹی دینا چاہتا ہے اور پاکستان کو ایٹمی اور فوجی صلاحیت سے محروم کرنا چاہتا ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اب یہودی لابی افغانستان اور عراق میں ہونے والی شدید مزاحمت اور عالمی معاشی عدمِ استحکام کے باعث امریکہ کے زوال کو بہت قریب دیکھ رہی ہے۔ چنانچہ امریکہ کے زوال سے قبل یہودی امریکہ کو ایک آخری مرتبہ بھرپور طور پر اسی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں جس طرح یہودی گذشتہ صدی میں ڈوبتی ہوئی سلطنتِ برطانیہ سے اپنے لئے اسرائیل حاصل کرکے برطانیہ کو اپنے مفتوحہ علاقوں میں سے اپنے اقتدار کے سائے کو سمیٹتے ہوئے اکیلا چھوڑ گئے تھے۔

یہودی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ کعبہ یعنی بیت اللہ مسلمانوں کی مرکزیت کی علامت ہے اور جب تک بیت اللہ موجود رہے گا، اس وقت تک مسلمانوں کے متحد ہونے کا امکان تلوار بن کر یہودیوں کے سر پر لٹکا رہے گا اور اگر کبھی مسلمانوں کو صلاح الدین ایوبی جیسی قیادت میسر آگئی اور مسلمانوں نے متحدہ جدوجہد کا آغاز کردیا تو پھر کوئی مسلمانوں کے اس سیلِ رواں کا راستہ نہیں روک سکے گا۔ چنانچہ اس کا علاج یہی ہے کہ اس امکان کا سدباب کردیا جائے اور اس کے لئے بروقت اور بھرپور طاقت کا استعمال کرکے معاذ اللہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو ہی صفحہ ہستی سے مٹادیا جائے!!

عین ممکن ہے کہ اس تناظر میں ہماری اس بات کو شاید بعض بزعم خود روشن خیال حضرات محض ایک گپ یا مسلمانوں میں خوف وہراس پھیلانے اور بین المذاہب ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوششوں کے خلاف ایک سازش قرار دیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ مغرب میں بعض تھنک ٹینک مسلمانوں کے ان مقدس مقامات کو مٹانے کی باقاعدہ سازشیں کررہے ہیں اور امریکہ کا موجودہ صدر باراک اوباما بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔ اس ضمن میں بطورِ ثبوت ایک خبر ملاحظہ ہو:

''پاکستان کی قومی اسمبلی میں بدھ کو متوقع امریکہ صدارتی امیدوار باراک اوباما اور ٹام ٹینکریڈو موضوعِ بحث رہے اور ملک کی خارجہ پالیسی پر تقاریر کرتے ہوئے حکومتی اور اپوزیشن ارکان نے امریکی رہنماؤں کو پاکستان اور عالم اسلام کے جذبات مجروح کرنے والے مبینہ بیانات پر کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔

ڈیموکریٹ اوبامہ اور ریپبلکن ٹینکریڈو نے حال ہی میں اپنے بیانات میں پاکستان میں القاعدہ کے ٹھکانوں اور مسلمانوں کے مقدس شہروں مکہ اور مدینہ پر امریکی حملوں کی بات کی تھی۔

(بی بی سی اردو ویب سائٹ: ۱۷ اگست ۲۰۰۷ء)

بالعموم دیکھا گیا ہے کہ جب بھی عام مسلمانوں کے سامنے بعض اہل مغرب کے مبنی بر حقد و حسد اِس قسم کے بیانات کا خلاصہ کیا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ ایسا ممکن ہی نہیں کہ کوئی بیت اللہ یا مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو کوئی نقصان پہنچا سکے اور بطورِ دلیل قرآن کی سورۃ الفیل کو پیش کرتے ہیں کہ جب کوئی ایسی ناپاک کوشش کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو اللہ تعالیٰ نے ابرہہ اور اس کے لشکر کے ساتھ کیا حالانکہ قرآنِ کریم میں اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے محض ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ جب بیت اللہ پر حملہ آور ہونے والے دشمن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ سلوک کیا، مگر کسی بھی مقام پر یہ وعدہ نہیں کیا گیا کہ آئندہ کبھی مکہ پر حملہ ہوا تو پھر حملہ آور کا ایسا ہی حشر ہوگا بلکہ اس کے برخلاف نبی کریم ﷺ نے ہمیں جو خبر دی ہے، اس میں ایسی ایک انہونی کے ہونے کا برملا تذکرہ فرمایا ہے۔ یہ حدیث بخاری و مسلم سمیت متعدد کتب احادیث میں مختصراً اور مسند احمد وغیرہ میں مفصل موجود ہے جس میں مسلمانوں کے دورِ زوال کا ذکر ہے کہ مسلمانانِ عالم اپنے دورِ زوال کے دوران جس آخری انتہا پر پہنچیں گے، اس کی خبر دیتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ

«يخرب الكعبة ذو السويقتين من الحبشة ويسلبها حليتها ويجردها من كسوتها ولكأني أنظر إليه أصيلع أفيدع يضرب عليها بمسحاته ومعوله»

''عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اہل حبشہ میں سے پتلی پنڈلیوں والا ایک شخص بیت اللہ کو تباہ کردے گا، اس کے خزانہ کو ضبط کرلے گا، اس کے پردہ کو کھینچ کر پھاڑ دے گا۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اس وقت اپنی آنکھوں سے وہ منظر

دیکھ رہا ہوں کہ وہ گنجا [کشادہ اور اُبھری پیشانی والا] اور ٹیڑھے جوڑوں والا حبشی شخص بیت اللہ پر مستقل لوہے کے ہتھیار سے حملے کر رہا ہے۔'' (مسند احمد: ۲/۲۲۰)

اس حدیثِ نبویؐ میں بیت اللہ پر حملہ کرنے والے جس شخص کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کی پہلی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ اس کا تعلق حبشہ سے ہوگا، نبی کریم ﷺ کے زمانے میں حبشہ ایک ریاست تھی جو مشرقی افریقہ کے وسیع رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں موجودہ زمانے کے ممالک صومالیہ، ارٹیریا، ایتھوپیا اور کینیا وغیرہ سب شامل تھے اور باراک اوباما کا تعلق قدیم حبشہ کے اسی علاقہ کینیا سے ہے۔

مذکورہ بالا حدیث میں اس شخص کی دوسری نشانی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ پتلی پتلی پنڈلیوں والا ہوگا اور اکثر لوگوں کو یاد ہوگا کہ اپنی صدارتی مہم کے آخری دنوں میں ریپبلیکن اُمیدوار جان میکین نے باراک اوباما کی ٹانگوں کو بطورِ خاص تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اس کا مذاق اُڑایا تھا۔ اِس کے ساتھ کشادہ اور اُبھری ہوئی پیشانی کی علامت بھی اوباما میں موجود ہے۔

اسی طرح مدینہ منورہ کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے جو خبر دی ہے، وہ سنن ابوداؤد میں مذکور ہے اور علامہ البانیؒ کی تحقیق کے مطابق یہ روایت صحیح ہے۔ نبی کریم ﷺ کی اس پیش گوئی کے الفاظ یہ ہیں:

عن معاذبن جبل قال: قال رسول الله ﷺ: «عمران بيت المقدس خراب يثرب وخراب يثرب: خروج الملحمة وخروج الملحمة فتح قسطنطينية وفتح قسطنطينية خروج الدجال» (سنن ابوداؤد: ۴۲۹۴)

''نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بیت المقدس میں ہونے والی ایک تعمیر یثرب (مدینہ منورہ) کی تباہی کا سبب بنے گی اور مدینہ کی تباہی کے نتیجہ میں جنگِ عظیم کا آغاز ہوگا اور جنگِ عظیم قسطنطنیہ (استنبول) کی فتح کا پیش خیمہ ثابت ہوگی اور اسی کے ساتھ مسیح دجال نکلے گا۔''

اس حدیث کے مطابق بیت المقدس میں جس تعمیر کا تذکرہ ہے، غالباً اس سے مراد یہودیوں کے ہیکل سلیمانی کی تعمیر ہے جس کے نتیجہ میں عالم اسلام کے مسلمانوں کا شدید احتجاج ہوگا اور انتقامی کاروائی کے طور پر دنیا بھر میں مسلمانوں کی جانب سے اہل مغرب کے مفادات پر حملے کئے جائیں گے اور اس کے جواب میں اہل مغرب کی جانب سے مدینہ اور مکہ

پر حملے کئے جائیں گے اور غالباً اسی دوران استنبول کو یورپ کا حصہ قرار دیکر اہل مغرب اس پر قبضہ کرلیں گے اور اس کے نتیجہ میں تیسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوجائے گا۔ اس جنگ کے نتیجہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کا شدید جانی اور مالی نقصان ہوگا، مگر بالآخر مسلمان استنبول کو دوبارہ فتح کرلیں گے۔ اس موقعہ پر مسلمانوں کی تعداد قلیل اور عیسائیوں کے معاشی طور پر دیوالیہ ہوجانے کا فائدہ اُٹھا کر یہودی اپنی عالمی بادشاہت کا اعلان کردیں گے اور یہودی بادشاہ مسیح دجال منظر عام پر آجائے گا۔ اوران تمام واقعات کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہوگا، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ

أن رسول الله ﷺ قال: «بين الملحمة وفتح المدينة ست سنين ويخرج المسيح الدجال في السابعة» (سنن ابوداؤد:۴۲۹۶)

''نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جنگِ عظیم اور فتح مدینہ یعنی استنبول چھ سال کی مدت میں پیش آئیں گے جبکہ مسیح دجال کے خروج کا معاملہ ساتویں سال پیش آئے گا۔

مگر بظاہر اس پورے منظر نامہ کو دیکھتے ہوئے ایک اہم سوال جو عام ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کی جو حالتِ زار موجودہ زمانہ میں ہے یعنی مسلمان معاشی اور عسکری اعتبار سے پسماندگی کا شکار ہیں جبکہ اہل مغرب ہر قسم کے جدید ہتھیاروں سے لیس ہیں، اس کے باوجود کس طرح مسلمان اہل مغرب کو شکست دیں سکیں گے؟ تو اس کا جواب خود احادیث میں موجود ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

أن النبي ﷺ قال: «سمعتم بمدينة جانب منها في البر وجانب منها في البحر» قالوا: نعم يا رسول الله. قال: «تقوم الساعة حتى يغزوها سبعون ألفا من بني إسحٰق فاذا جاءوها نزلوا فلم يقاتلوا بسلاح ولم يرموا بسهم، قالوا: لا إله الا الله والله أكبر فيسقط أحد جانبها.» قال ثور: لا أعلمه إلا قال الذي في البحر. «ثم يقولوا الثانية: لا إله إلا الله والله أكبر فيسقط جانبها الآخر. ثم يقولوا الثالثة: لا إله إلا الله والله أكبر فيفرج لهم فيدخلوها فيغنموا فبيناهم يقتسمون المغانم إذ جاء هم الصريخ. فقال: إن الدجال قد خرج فيتركون كل شيء ويرجعون»

''نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سنا ہے کہ ایک ایسا شہر ہے جس کے ایک جانب خشکی اور ایک جانب سمندر ہے؟ صحابہ کرامؓ نے فرمایا: ہاں یا رسول اللہ ﷺ! (یعنی وہ قسطنطنیہ ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا: قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی حتیٰ کہ اسحٰق علیہ السلام کی اولاد میں سے ستر ہزار افراد اس شہر میں تمہارے مقابلے کے لئے نازل نہ ہوں گے (یعنی ایک جانب سے بحری اور دوسری جانب سے فضائی افواج حملے کے لئے اُتریں گی)۔ تمہارے پاس ان کے مقابلے کے لئے تیر وتلوار (یعنی ان کے ہم پلہ اسلحہ) نہیں ہوگا تو اس وقت تم صرف لا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہو گے اور ایک فوج جو سمندر کی جانب ہوگی، گر جائے گی (یعنی غرق ہوجائے گی) پھر دوسری مرتبہ لا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہو گے تو دوسری جانب کی بری فوج گر جائے گی (یعنی زمین میں دھنس جائے گی)۔ اس کے بعد تم تیسری مرتبہ لا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہو گے تو ہر طرف کھل جائے گا (یعنی باقی دشمن بھاگ کھڑے ہوں گے)۔ پھر شہر میں داخل ہوکر تم مالِ غنیمت سمیٹو گے کہ اچانک اعلان ہوگا کہ دجال نکل آیا ہے۔ تب تم ہر چیز کو چھوڑ کر دجال کی طرف پلٹو گے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح قسطنطنیہ کسی مقابلہ کے نتیجہ میں نہیں بلکہ خالصتاً معجزاتی طور پر مسلمانوں کو عطا کی جائے گی اور غالباً اس کا مقصد مسلمانوں کی حالتِ ایمانی کو انتہا درجہ پر لے جانا مقصود ہے تاکہ اس کے فوراً بعد خروجِ دجال کا جو واقعہ ظہور پذیر ہونا ہے، اس کے مقابلہ کی اہلیت مسلمانوں میں پیدا ہوسکے۔ چونکہ خروجِ دجال سے بڑا فتنہ نوعِ انسانی میں کبھی رونما ہوا ہے اور نہ اس کے بعد کبھی ہوگا، چنانچہ اس فتنہ کا مقابلہ صرف وہی مسلمان کرسکیں گے جن کی ایمانی کیفیت عام سطح سے بہت بلند ہوگی۔

اسی نوعیت کا ایک اور اشارہ ایک دوسری حدیث سے بھی ملتا ہے جس کے مطابق مسیح دجال کی آمد کے زمانہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ مؤمنین کو ایک اور کرامت بھی عطا فرمائے گا، یہ حدیث سنن ابن ماجہ، مسند احمد اور مسند ابی یعلی وغیرہ میں بعض صحیح اور بعض ضعیف طُرق کے ساتھ مروی ہے اور علامہ البانیؒ نے اسے اپنی کتاب قصة مسيح الدجال میں نقل فرمایا ہے۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ

«وإن قبل خروج الدجال ثلاث سنوات شداد يصيب الناس فيها جوع شديد يأمر الله السماء. في السنة الأولى أن تحبس ثلث مطرها ويأمر الأرض فتحبس ثلث نباتها ثم يأمر السماء في الثانية فتحبس ثلثي

مطرها ويأمر الأرض فتحبس ثلثي نباتها ثم يأمر الله السماء في السنة الثالثة فتحبس مطرها كله فلا تقطر قطرة ويأمر الأرض فتحبس نباتها كله فلا تنبت خضراء فلا تبقى ذات ظلف إلا هلكت إلا ماشاء الله» قيل: فما يعيش الناس في ذلك الزمان؟ قال: التهليل والتكبير والتسبيح والتحميد ويجرى ذلك عليهم مجرى الطعام (۱۳۸/۱)

''نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مسیح دجال کی آمد سے قبل تین سال لوگوں کے لئے شدید مصائب کے ہوں گے۔ اس زمانہ میں شدید قحط پڑے گا، اللہ تعالیٰ آسمان وزمین کو حکم دے گا۔ چنانچہ پہلے سال آسمان اپنا تہائی پانی روک لے گا اور زمین تہائی نباتات سے خالی ہوجائے گی، دوسرے سال آسمان باقی ماندہ پانی میں سے مزید تہائی پانی روک لے گا اور زمین باقی ماندہ سبزہ میں سے مزید تہائی سے محروم ہوجائے گی۔ پھر تیسرے سال اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق آسمان سے ایک قطرہ پانی نہیں برسے گا اور پوری روئے زمین چٹیل میدان ہوجائے گی اور تمام چرند پرند ہلاک ہوجائیں گے، ماسوائے ان کے جنہیں اللہ باقی رکھنا چاہے۔ صحابہ کرامؓ نے سوال کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! ایسے حالات میں انسان زندہ کیسے رہیں گے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت مؤمنین کا سبحان اللہ، الحمدللہ اور اللہ اکبر کہنا ان کی غذائی ضرورت کو پورا کرنے اور روح وبدن کے رشتہ کو قائم رکھنے کے لئے کفایت کرجائے گا''۔

بہرکیف مذکورہ بالا تمام اخبار واحادیث کو مدنظر رکھتے ہوئے اور موجودہ زمانہ میں صہیونیت کے علمبردار یہود ونصاریٰ کی نیسری عالمی جنگ چھیڑنے کی شدید خواہش اور کوششوں کو موجودہ امریکی صدر کے اقوال وعزائم کی روشنی میں دیکھتے ہوئے بظاہر نظر یہی آتا ہے کہ آدم وابلیس کے درمیان جس خیر وشر کی کشمکش کا آغاز روزِ اوّل ہوا تھا، اس کا آخری معرکہ بہت نزدیک ہے بقول علامہ اقبال:

اسلام کو پھر معرکہ روح وبدن پیش — تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مؤمن پہ بھروسہ — ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

اس زمانہ میں اس بات سے تو کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ امریکہ اور یورپ اس وقت صہیونیت کے شکنجہ میں پوری طرح کسے جاچکے ہیں جس کے باعث مغربی سیاست میں اسرائیل کا تحفظ اور دفاع تمام حکومتوں اور خصوصاً امریکہ کے لئے اوّلین ترجیح کی حیثیت

رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے تقریباً تمام ہی صدور ماسوائے ابرہام لنکن اور جان ایف کینڈی کے، اسرائیل نواز رہے ہیں مگر موجودہ صدر باراک اوباما کے بارے میں متعدد ویب سائٹس پر یہ بات موجود ہے کہ باراک اوباما کھلم کھلا فری میسن صہیونی، ایلمینٹی عیسائی ہے، اس کی تصدیق باراک اوباما کے صدر منتخب ہونے کے بعد کئے جانے والے ابتدائی اقدامات سے بھی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں پہلی خبر یہ ہے کہ باراک اوباما نے چیف آف آرمی اسٹاف کے لئے ایک صہیونی یہودی ایمانویل کو منتخب کیا ہے اور اپنا مشیر خاص بھی ایک یہودی کو منتخب کیا ہے جبکہ ایشیا سے متعلق معاملات کی دیکھ بھال کے لئے مسلمان دشمن اور اقلیتوں کے قتل میں ملوث انتہا پسند ہندو جماعت وشوا ہندو پریشد کی سابقہ نیشنل کوآرڈی نیٹر رخاتون سونل شا، کو اپنا مشیر مقرر کردیا ہے۔ سونل شا کے ادارے انڈی کارا پس کا بانی گجرات کے وزیر اعلیٰ اور لاکھوں مسلمانوں کے قاتل نریندر مودی کا قریبی دوست ہے۔ انڈی کارپس کی پاٹنر شپ ایکال ودیالاس کے ساتھ ہے جو وشوا ہندو پریشد کا حمایت یافتہ ہے اور سکولوں میں ہندو طلبہ کو غیر ہندوؤں سے نفرت کی تعلیم دیتا ہے۔ مزید برآں اسی ایکال ودیالاس نے بھارتی ریاست مدھیہ پردیش اور اڑیسہ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف فسادات کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

مزید برآں نئے امریکی صدر باراک اوباما کی اخلاقی ساکھ بھی خود ان کے اپنے معاشرے میں انتہائی مشکوک اور متنازع فیہ ہے۔ متعدد ویب سائٹس کے الزامات کے مطابق باراک اوباما ایک ہم جنس پرست اور کوکین کے نشہ کے عادی انسان ہیں جس کے ثبوت ان کی صدراتی مہم کے دوران بھی انٹرنیٹ پر فراہم کئے گئے ہیں، مگر باراک اوباما نے کبھی اس قسم کے الزامات کی تردید کرنے یا ان الزامات لگانے والے افراد کے خلاف کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔ حتیٰ کہ وہ امریکی میڈیا جس نے سابق امریکی صدر کلنٹن کے ایک جنسی اسکینڈل پر ساری دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کردیا تھا، باراک اوباما کے ان سکینڈلز پر پراسرار طور پر خاموش ہے۔

علاوہ ازیں باراک اوباما کا سیاسی میدان میں ناتجربہ کار ہونا بھی ان کی سیاسی ساکھ پر ایک

سوالیہ نشان ہے، کیونکہ یہودیوں کے ہاتھوں یرغمال ایک ایسے امریکی معاشرے میں جہاں یہودیوں کی معاشی اور اخلاقی مدد کے بغیر کوئی شخص کسی ریاست کا گورنر نہیں بن سکتا، کسی مڈل کلاس شخص کا امریکی صدارتی عہدہ پر بغیر کسی مضبوط سیاسی ساکھ کے پہنچ جانا اکثر سیاسی اُمور کے ماہرین کی رائے میں انتہائی قابل اعتراض، پرسرار اور خود امریکہ کے لئے خطرناک ہے۔

پس مندرجہ بالا تمام شواہد کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے خلاف ہندو یہودی اور عیسائی صہیونی اتحاد قائم ہو چکا ہے اور اس کی علامت باراک اوباما کی شکل میں ظاہر ہو چکی ہے۔ اس منصوبے کے تین ہدف ہیں:

اوّلاً: پاکستان کو معاشی، سیاسی اور معاشرتی عدمِ استحکام سے دوچار کر کے عسکری اور نظریاتی طور پر ختم کرنا۔

ثانیاً: جمی کارٹر کے ۱۹۷۳ء کے جینوسائیڈ منصوبہ کے مطابق تیسری دنیا کے غریب ممالک کو جعلی معاشی بحران کے ذریعہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کا غلام بنانا، غذائی اجناس کی طلب ورسد میں نقلی تفاوت پیدا کر کے غربت وافلاس کے بہانے قحط پیدا کر کے آبادی کو کم کرنا، عالمی سیاسی بساط پر اپنے نمائندوں کے ذریعہ جھوٹ اور فریب کاری سے عالمی جنگیں برپا کر کے امیر ممالک کی معیشت کو مفلوج کرنا جیسا کہ عراق اور افغانستان میں امریکہ کے ساتھ کیا گیا۔

اور ثالثاً: مسلمانوں کے مقدس مقامات مکہ اور مدینہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کی مرکزیت کو ختم کرنا اور یہ تیسرا کام ایک ایسا شخص ہی کرسکتا ہے کہ ایک جانب جس کا سینہ اسلام کی نفرت سے جل رہا ہو اور دوسری جانب ناتجربہ کاری کے باعث وہ سیاسی بصیرت سے محروم ہو تاکہ اپنے کسی غلط اقدام کے نتائج وعواقب کا قبل از وقت اِدراک کرنے سے قاصر ہو۔ تیسری جانب امریکی معاشرے کے ایک ایسے طبقہ سے تعلق رکھتا ہو کہ جس کے لئے امریکی معاشرے اور میڈیا میں ہمدردی موجود ہو تاکہ مطلوبہ مقاصد کی تکمیل ہونے کے بعد امریکی میڈیا کی شدید تنقید کے نتیجہ میں اسے بآسانی منظر سے ہٹایا جاسکے۔ پس یہی اسباب ہیں کہ یہودی لابی نے باراک اوباما کو ایک ناتجربہ کار، سیاہ فام اور مسلمان باپ کی اولاد ہونے کے باوجود امریکہ کی صدارت کے لئے منتخب کیا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور ہمارے حکمرانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار ہونے اور اس عالمی سازش سے نمٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

LRL No. 183
Vol.41 NO.8
Monthly MUHADDIS Lahore
5866476
5866396

عناد اور تعصب قوم کے لیے زہرِ ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں

لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر اِفہام وتفہیم اُمت کے لیے رحمت کا باعث ہے۔

علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکارِ انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں

لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے

لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیتِ دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالحِ دینیہ کے خلاف ہے

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین ومسائلِ اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

آئین وسیاست سے بیگانہ ہو کر عبادت کے لیے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ محدث لاہور

کا مطالعہ فرمائیے، آپ اس کو ان جملہ صفات ومحاسن سے مزین پائیں گے، اِن شاء اللہ!
کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

قیمت فی شمارہ ۲۰ روپے ــــــــ زرِ سالانہ ۲۰۰ روپے

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL 99-J, Model Town, Lahore 54700